

سیرۃ امام اعظم ابو حنیفہؒ

اتهام شیعیت کی حقیقت

مرتبہ

پروفیسر حکیم سید علی احمد عباسی ایم، ایں، سی علیگ

فاضل اسلامیات

محمود بی ایرما لیاقت آباد کراچی ۱۹

۱۷۷۳۱

نام کتاب۔

سیرۃ امام اعظم ابوحنیفہؒ (اتهام شیعیت کی حقیقت)

نام مؤلف۔

پروفیسر حکیم سید علی احمد عباسی ایم ایس، علیک

مطبوعہ۔

مطبع سعیدی قرآن محل کراچی

سال طباعت۔

اکتوبر ۱۹۷۷ء

تعداد۔

ایک ہزار

قیمت۔

صرف تین روپے

ناشر

مکتبہ محمود پیم بی ایس یا لیاقت آباد کراچی ۱۹

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	تعارف	۵
۲	پیش لفظ	۱۴
۳	تخصیصت امام اعظم ابو حنیفہؒ (نام و نسب)	۲۲
۴	حقیقت عرفی	۲۴
۵	کوفہ	۳۱
۶	مواقف اساتذہ	۳۵
۷	اشیوخ و الفقہاء	۳۸
۸	امام ابو حنیفہؒ اور سیاحی ہنگامے	۴۶
۹	امام ابو حنیفہؒ اور زید بن علی بن الحسین	۵۰
۱۰	امام ابو حنیفہؒ اور امیر ابن حبیرہ	۶۲
۱۱	امام ابو حنیفہؒ اور امیر حسن بن محطیہ	۶۹
۱۲	امام ابو حنیفہؒ اور محمد الارقط حسینی	۷۲
۱۳	ایک اور افتراء	۷۹
۱۴	یعقوبی انسانہ	۸۵
۱۵	امام ابو حنیفہؒ اور ابراہیم حسنی	۸۷
۱۶	امیر المؤمنین المنصور امام ابو حنیفہؒ اور مکتبہ حنفیہ	۹۲
۱۷	حرکت علمی	۹۵

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱۰۰	عرف	۱۸
۱۰۷	۳ تحریری کام	۱۹
۱۰۸	۴ کتاب الآثار	۲۰
۱۰۹	۵ امام صاحب کی کتابیں	۲۱
۱۱۲	فقہ حنفی	۲۲
۱۱۴	مکتبہ حنفیہ	۲۳
۱۱۷	۶ علامہ امام	۲۴
۱۲۴	اصحاب امام مالک	۲۵
۱۲۷	دیگر ائمہ	۲۶
۱۳۳	وفات امام	۲۷
۱۳۸	تدفین	۲۸
۱۴۱	امام اعظم ابو حنیفہ اور شیعیت	۲۹
۱۴۵	افذر روایت میں سختی	۳۰
۱۴۷	مواقف اقربائے حسین	۳۱
۱۸۲	دعوت عباسیہ اور آلِ عبدالمناف ابو طالب	۳۲
۱۸۸	واہی افراء	۳۳
۱۹۱	سیاہ رنگ	۳۴
۱۹۲	اموی سادات	۳۵
۲۰۷	اندلس کی اموی امارت و خلافت	۳۶
۲۱۲	اختلاف مذاہب	۳۷
۲۱۷	ایک قابل توجہ جائزہ	۳۸

تعارف

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے سوانح و تذکرہ کی یہ نئی کتاب اس اعتبار سے
 اور بھی قابل قدر و لائق توصیف ہے کہ امام صاحب کے مکتون مذہب اور سیاسی مسلک کے
 بارے میں جو خلافت واقعہ وائٹیں اور وضعی قصے کہانیاں صدیوں سے مشہور ہیں ان فاضل
 مولف کتاب نے تحقیق و ریسرچ کے اعلیٰ معیار سے انھیں جانچا دیکھا ہے جس سے یہ
 حقیقت روز روشن کی طرح عیاں و منکشف ہو گئی کہ یہ سارے قصے و لایعنی فضولیات اسی
 رہبرِ بے پرویگندے کا شاخسانہ ہیں جو اموی و عباسی خلفاء کی تنقیص اور ان علوی
 باغیوں کی مدح و تقدیس میں برابر و متواتر ہوتا رہا ہے جو وقتاً فوقتاً حکومت قائمہ کے
 خلاف باوعائے تفاخر نسب خروج و بغاوت کر کے فاسق و فاسد رہے۔ جسے اسی سلسلے
 میں یہ داستانِ سرائی بھی کی جاتی ہے کہ امام صاحب نے ہا چونکہ ابنار فارس سے ہیں۔
 اور مولد و منشاء بھی آپ کا شیخان علی کامر کزی شہر کوفہ تھا جسے حضرت علیؑ نے اپنے
 مختصر سے ایام خلافت میں مدینۃ النبی کے بجائے دار الخلافہ سیاسی مصالح سے بنالیا تھا یہ
 واقعہ امام صاحب کی ولادت سے کوئی چوالیس سال قبل کا ہے مگر کہا جاتا ہے کہ امام صاحب
 کے والد ثابت کو جو اس زمانے میں کم سن تھے آپ کے دادا نے حضرت علیؑ کے حضور
 وعائے خیر و برکت کے لئے پیش کیا تھا۔ امام صاحب کے اجداد میں ان کے دادا ہی مشرف باسلام ہوئے تھے۔
 حضرت نے اس فارسی بچے کو دعائے خیر دی تھی پس اسی ایک واقعہ سے جو آپ کے والد
 ثابت کے بچپن کا بتایا جاتا ہے زامام صاحب کو علوی فائنان کا اسدرجہ عقیدہ مند ظاہر کیا
 گیا ہے کہ جب کوئی علوی و قاطمی آپ کے زمانے میں خلیفہ وقت کی اطاعت سے منہ موڑ کر
 ہرج ماعت سے علیحدگی اختیار کر کے شریعت کے واضح احکام کی خلاف ورزی میں خسر و خوج

بغاوت کا اقدام کر بیٹھتا۔ امام صاحب حمایت سے اس کی نہ چوکتے خفیہ خفیہ مالی امداد کیا کرتے بلکہ ایک علوی کے خروج و بغاوت کو تو کہا جاتا ہے۔ آپ نے غزوہ بدر کے معاذ اللہ شامل قرار دے ڈالا تھا۔ لیکن اس مفروضہ غزوہ و جہاد میں بذات خود شریک ہونے کی سادت حاصل نہ کی۔ اسی ضمن میں یہ کذب بیانی بھی کی جاتی ہے کہ اموی خلافت میں تو کوڑے لگوانے کی سزا آپ کو دی گئی۔ اور عباسی خلیفہ نے عہدہ قضا پر تقرر کرنا چاہا انکار رحیم و بندگی سزا دی بعد میں نہر و دیگر مراد والا۔ یہ سارے واضحی قحطے اور وضعی بدولتیں قطعاً بے بنیاد ہیں۔ فاضل مولف نے نقد و روایت سے ان فضولیات کی علمی پوری طرح کھول دی ہے اور روایتاً و درایتاً ثابت کر دکھایا ہے کہ امام صاحب کی ایذا دہی و اہانت کے بجائے عجمی خلافت میں آپ کی مناسب قدر و منزلت کی گئی۔

مگر معظّم میں چند سال متواتر قیام کرنے کے بعد بروایت صدرالائمہ امام اعظمؒ فرمایا کہ امیر المومنین ابو جعفر المنصور عباسیؒ کو فہم واپس کائے (ج ۱ ص ۲۲) امیر المومنین کی پہلی ملاقات کو حاضر و بار ہوئے امیر عیسیٰ بن موسیٰ عباسی نے ہذا اَعْلٰی لَکُمُ الدِّیْنُ الْیَوْمَ (آج یہ تمام دنیا میں سب سے بڑے عالم ہیں) کہہ کر تعارف کرایا۔ فاضل مولف کتاب نے مستند حوالہ سے بتایا ہے کہ امیر المومنین نے فرمایا۔

اے نعمان! تم نے کہاں کہاں علم فاضل کیا ہے۔ امام اعظمؒ نے جواباً کہا۔ کہ میں فاروق اعظم حضرت عمرؓ حضرت علیؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علمی سرچشموں سے سیراب ہوا ہوں۔ امیر المومنین نے یہ سنکر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا۔ اے نعمان! تم نے ایسا علمی رشتہ الطیبین الطاہرین المبارکین رضی اللہ عنہم اجمعین سے مضبوط قائم کیا ہے۔ پھر اہل علم کے بغایت قدروان و سرست خلیفہ نے جو بذات خود بلند پایہ عالم و محدث تھے اور ملت اسلامیہ میں باضابطہ علمی تحریک کے بانی اور جاری کرنے والے تھے۔ امام صاحب کو لغزت و احترام اپنے پاس

دینی و علمی مہمات اسور کی انجام رہی ان کے پیروں کی جو امام صاحب مرتے دم تک انجام دیتے رہے۔

مودودی صاحب نے اپنی سوائے زمانہ کتاب "خلافت و ملوکیت" ہیں جس کے چند فقرے شیعہ کتب پر نوٹس لے بھی درج کئے ہیں جو یہ غلط بیانی عصیت باحلی کے جذبہ سے کی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے بذات خود غیر سرکاری طور سے فقہ کی تدوین کی۔ اس کی مکمل تردید ہماری تالیف "حقیقت خلافت و ملوکیت" میں کی جا چکی ہے اور فاضل مولف نے بھی تدوین فقہ کے اس عظیم کاز پر سرپرستی خلافت عباسیہ انجام دیا جانا اور رائج ہونا عجب بیان مستند حوالوں سے پیش کیا ہے سبائی راویوں اور علوی باغیوں کے طرفداروں نے امام صاحب کے قید و بند و ہتک حرمت کی روایتیں اور پختے جو تراشتے ہیں محض فضیلت ہیں۔

حضرت امام اعظم کو سیاسی ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دینی اور علمی ماحول میں ساری عمر بسر کی۔ احکام شریعت کی متابعت میں اور اپنے اساتذہ کرام خصوصاً حضرت عطاء بن ابی رباح کے مسلک و موقف کے اعتبار سے جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد و رشید تھے امام صاحب پوری طرح جماعت سے وابستہ رہے اور تعلیمات نبویہ کے مطابق خلیفہ وقت کی اطاعت پر مضبوطی سے قائم رہ کر فتنہ و فساد کی تحریکوں سے فحتر ز رہے لہذا اے آیت کریمہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَتُوا بِأَهْلِيكُمْ ذِكْرًا لِّئَلَّا تُذْخَرُوا فِي الشَّيْءِ مِنْهُم فَيُذْخَبُوا فِي مَعْصِيَةٍ كَذِبَةٍ** (جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور گروہ (شیعہ) بن بیٹھیں (اے رسول) تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ تفرقہ بازوں سے حضرت امام اعظمؒ بھی ایسے متنفر رہے کہ شیعہ راویوں سے جو صحابہ کی توہین کر کے علم دین کے لئے خطرہ ہیں اور تفسیر کا عقیدہ بھی انہیں اور مشکوک کر دیتا ہے۔ روایت لینا جائز نہ سمجھتے تھے۔ امام عبد اللہ

بن المبارک کی سند سے یہ قول آپ کا منقول ہے کہ اہل ہوا (اہل بدعت) سے روایت لی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ عادل ہوں۔ (الا لشیعة خات) اصل عقیدہ تھم تفضیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم) لیکن شیعہ سے روایت نہ لی جائے کیونکہ ان کے عقیدے کی غمارت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی توہین تفضیل پر ہے۔ (الکفایہ فی علم الروایۃ) اب دیکھئے جو پیشوائے مذہب و امام اہل سنت والجماعت کسی شیعہ سے روایت قبول کرتے کے بھی روا دار نہ ہوں۔ حضرات شیخین السیدین کی فضیلت کو مذہب اہل سنت کی پہچان بتا کر یہ فرمایا کرتے ہوں

ثم نقول ان افضل هذا الدماء اعني خير الامم بعد نبينا محمد صلي الله عليه وسلم ابو بكر ثم عمر ثم عثمان ثم علي (کتاب الوصیۃ امام ابو حنیفہ) یعنی پھر ہم یہ اقرار کریں کہ شب سے افضل اس امت یعنی خیر الامم میں بعد ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابو بکرؓ ہیں پھر عمرؓ پھر عثمانؓ پھر علیؓ ان ہی پیشوا و امام اعظمؓ کو مذہب شیعہ بتانے کو کسی شیعہ نے جو اپنے نام کے ساتھ "اجتہادی" کا دم چھلا بھی لگاتے ہیں۔ ایک بچہ کتابچہ اس نام سے شائع کر رہا ہے

امام ابو حنیفہ شیعہ تھے۔ تاریخی انکشاف۔

مگر لطف تو یہ کہ اس "تاریخی بکواس" کی کاپی و مکمل تردید و تکذیب خود ان ہی کے علماء و سابقین کی تحریرات بالخصوص شیخان ہند کے "شہید ثالث" قاضی نور اللہ شوشتری علیہ ما علیہ جیسے غالی شیعہ کی تصدیقات سے ہو جاتی ہے۔

سلسلہ یہ شوشتری عہد اکبری میں لاہور کے قاضی تھے اور بقول شیخ علی حزیں شمس قیصر سے

سنی بنے ہوئے تھے۔ اپنی تالیفات میں جو خطبہ رکھتے۔ خصوصاً کتاب مجالس المؤمنین میں

جوان کی مشہور تالیف مجالس المؤمنین کے صفحات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ شوشتری نے بہت سے اکابر اہل تسنن حجتہ الاسلام امام غزالی شیخ سعیدی و مولانا رومی وغیرہم کو زمرہ شیعہ میں شامل کیا ہے۔ لیکن امام اعظمؒ کے بارے میں صاف کہہ دیا ہے کہ "ابو حنیفہ کوفی کہ امام اعظم حواجہ صفی ہاست (ج ۱ صفحہ ۲۸۰) نیز شہر کوفہ کے ذکر میں مزید لکھا ہے کہ "ابو حنیفہ باوجود کوفی الاصل ہونے کے مذہباً شیعہ نہ تھے۔ درآنحالیکہ کوفیوں کا شیعہ مذہب ہونا تو کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ البتہ کوفی الاصل کا سنی مذہب ہونا محتاج دلیل کا ہے" و اگرچہ ابو حنیفہ کوفی باشد" (ج ۱ صفحہ ۵۶) شوشتری کے علاوہ ایک اور شیعہ مولف حسن صدر الدین نے کتاب الشیعہ و فنون اسلام میں جس کا ایک ادیشن "شیعہ یا پدید آرنندگان فنون اسلام" ہے۔ اس غلط بیانی کے ساتھ کہ شیعوں کو اسلامی علوم و فنون میں سینوں پر تقدم ماورافوق ہے۔ علامہ سیوطی کے حوالے سے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سب سے پہلے شخص (اور مقصود اس پہلے شخص سے اہل سنت کے شخص سے ہے) جس نے علم فقہ میں کتاب مدون کی ابو حنیفہ تھے (صفحہ ۷۹)۔

شیعہ کتابچہ نویس نے اہتمام شیعہ کے ساتھ امام اعظم ابو حنیفہؒ کو

دلیقہ صفحہ ۸ اکابر صلیب کی سخت مذمت و بدگولی کی ہے۔ علمائے حق کی شکایت پر جہانگیر بادشاہ کے دربار میں طلب ہوئے۔ اپنی کتاب میں موفیہ کے تذکرے بھی درج کئے ہیں۔ بادشاہ کے پیر اور روحانی باپ شیخ سلیم چشتیؒ کے بارے میں پوچھا گیا۔ اہل گرفتہ شوشتری کی زبان سے ہر روایت مولف "سوانح شہید مالٹ" قلم ساق ملک پور نا تحقیق "کلمات نکلتے ہی سزاء" زبان گدڑی سے کہہ چکر قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۰۱۹ھ کا ہے۔

شاگرد بھی زید علی بن حسینؑ کا بتا دیا ہے اور دوسروں نے شیعوں کے چھٹے امام جعفر صادقؑ کا۔ شوشتری ہی نے اس شاگردی کی حقیقت بھی شیعہ جہت سے گستاخانہ طرز عبارت میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

حضرت امام جعفرؑ سے ابو صفیہ کی شاگردی صرف اس قدر تھی کہ ان حضرت سے کچھ حدیثیں سنی تھیں چونکہ وہ حضرت ان کو مردودوں میں سمجھتے تھے۔ ان سے تقیہ کرتے اور اظہار مذہب حق کا ان پر بروہ کرتے

شاگردی ابو صفیہ حضرت امام جعفرؑ میں قدر بودہ کہ از آنحضرت بعضے از احادیث شنیدہ و چون آنحضرت او را از مردودان میدانستند از وثیقہ می نمودہ اظہار مذہب حق باو نمی نمودہ (ج ۱ ص ۵۳۶)

فاضل مؤلف کتاب ہدای حضرت امام اعظمؑ کے اساتذہ کرام کا تذکرہ بالتفصیل کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ جعفر صادقؑ اور ان کے حجازی زید بن علی بن حسینؑ کا کوئی تعلق امام صاحب کے اکتساب علم سے نہ تھا۔ امام اعظمؑ ابو صفیہ کا شمار تو صفات تابعین میں ہے۔ ۲۲ صحابہ کرام میں سے جو ان کے ابتدائے عمر میں موجود ہے آٹھ بزرگواروں سے ملاقات ثابت ہے۔ ساہا سال قیام مکہ معظمہ میں رہتا۔ بقول صاحب درمختار آپ نے ۵۵ حج کئے تھے حرم کعبہ کی مسجد میں بیٹھے ہوتے تو مسائل شریعت پوچھنے والوں کا ایسا ہجوم ہوتا تھا کہ بقول امام لیث بن سعدؒ رایت الناس متقصفتین علیہ (میں نے دیکھا کہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں) یہ کیفیت اور یہ حالت کسی علوی و فاطمی بزرگ کی مجلس کی کہیں منقول نہیں۔ امام ابن حزم نے اپنی مشہور تالیف الملل والنحل (ج ۳ ص ۳۹) یہ بیان کرتے ہوئے کہ جعفر صادقؑ کی کوئی برتری و فضیلت علم میں

دین میں عمل میں دوسرے ہم عصر علماء محمد بن مسلم الزہری و قبیضہ بن ذویب و غیر ہم پر نہ
تھی، لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے اپنی فقہ بیس کتابوں میں جمع کی ہے اور اگر تلاش
کی جائے تو ان کی حدیث بھی قریب قریب اسی حد تک پہنچے گی۔ حالانکہ حسن رضہ
وحسینؓ کی فقہ دو ورق تک بھی نہیں پہنچتی۔ یہی حال علی بن حسین رضہ (زین العابدینؓ)
کا بھی ہے۔ محمد بن علی (یعنی محمد باقرؑ) کی حدیث اور فقہ ایک چھوٹے سے جبرقہ تک پہنچتی
ہے اور اسی طرح جعفر بن محمد (جعفر صادقؑ) کی بھی حالانکہ روافض کا دعویٰ یہ ہے
کہ امام کے پاس شریعت کا کل علم ہوتا ہے۔ جعفر بن محمد کے بعد تو ہمیں ان ائمہ
کے علم کا بالکل پتہ نہ چلا۔ حدیث میں نہ فقہ میں باوجودیکہ ان لوگوں کا زمانہ ہمارے
زمانے کے قریب ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ بیک واسطہ حضرت ابن عباسؓ کے اور دو واسطوں
سے حضرت فاروق اعظمؓ و حضرت علیؓ و حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علمی سرچشموں
سے سیراب ہوئے تھے۔ ہم عصر علوی حضرات سے جو ائمہ شیوہ میں شمار ہوتے
ہیں۔ اکتساب علم کا مطلق تعلق نہ تھا۔ ان کی علمی شان و جلالت ان حضرات سے
بہت بلند تھی۔ امام ابن المبارکؒ نے اپنے گرامی مندرست استاد کے فیوض و برکات
علمی کے بارے میں صحیح کہا ہے کہ

رَدِّیْ اَثَارِہٖ فَاَجَابَ فِیْہَا کَطِیْرَاتِ الْقَصُوْرِ مِنْ الْمُنْبَقَہِ
انہوں نے آثار کو روایت کیا تو ایسی بلند پروازی دکھائی جیسے شکاوی
پرندے بلند مقام سے اڑ رہے ہوں۔

وَلَمَّا لَمِنَ لَہٗ بِالْعِرَاقِ نَطِیْرٌ
ولا بالمشرقین ولا بالکوفۃ
نہ عراق میں ان کی کوئی مثال تھی
نہ مشرق و مغرب اور نہ کوفہ میں
اس پھر کتابچہ کے بدگوشتی مولف نے حضرت امام اعظمؒ کے بارے میں

یادہ گوئی کرنے کے علاوہ حضرات خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
 حضرت عمر فاروق اعظم و حضرت عثمان ذو النورین اور دیگر صحابہ کرام کی جناب میں
 گستاخی کرتے ہوئے شرف صحابیت کی تنقیص میں جو کلمات بد لکھے ہیں یا
 ازواج مطہرات ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ دَامَ الْمَوْمِنِیْنَ حضرت حفصہ
 جیسی ذوات عالیہ کو جو بعض قرآن وَمَنْ يَفْقَهُ هُنَاكَ لِلّٰهِ وُدُّهَا
 وَتَعْمَلُ صَالِحًا تُوَفِّرْهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ بنات طاہرات حضرت فاطمہ
 وغیرہ اور تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں۔ خارج از ایمان قرار دیتے ہوئے وضعی
 روایت کے اشارے و کنایہ سے لکھا جا رہا ہے کہ "شیعہ ان ازواج رسول کو بھی
 خارج از ایمان سمجھتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت ماریہ قبطیہ پر بہمت لگائی یا حضرت
 عثمان رضی اللہ عنہ کو نعل یهودی دن سے خارج اور واجب القتل کہا۔"

شیعی راویوں کی ان من گھڑت قطعی جھوٹی اور وہابی روایتوں کا کوئی خفیہ سا تعلق بھی حضرت
 امام عظیم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے سوانح حیات سے نہیں ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں اہل بیت
 (اہل خانہ) جبکہ بارے میں کذب و افتراء بنو بیانی کی گئی ہے چونکہ عاجز ادیاں ہیں حضرت ابوبکر الصدیق
 اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے ملت جلیل القدر صحابہ کرام کی جن سے عداوت و دشمنی شیعیت کی
 گویا اساس و بنیاد کی طرح ہے یہ بدگوشیہ کتابچہ نویس ان اہبات المومنین کی اس طرح بے موقع
 و بے محل تنقیص کرنے سے بھی کہوں باز رہتا بقولیکہ ہے

نیش عقرب نہ از پے کین است بد مقتضای طبعش ایں است

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر فاروق اعظم کی ذات مستجمع الصفات سے کچھ ایسی
 عقیدت تھی کہ اپنی نوریہ سیدہ ام کلثوم بنت سیدہ فاطمہ بنت رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم کو ان کی زوجیت میں دیا پھر اپنے ان داماد کے ایک دشمن اسلام
 ساز شعی کے ہاتھوں مقتول ہو جانے سے ان کے چارے کے پاس کھڑے ہوئے

کس حسرت سے یہ الفاظ کہے تھے "اے کاش اس امر سے بھی کچھ اعمال ایسے
 ہی ہوتے جیسے ان صاحب جواز سے کہ میں مگر بدگوشتی مولف نے ایک اختراعی
 واپسی فقے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی زبان سے جو حضرت
 علیؓ کے صاحبزادوں حسن و حسینؓ سے سن وصال میں جو وہ پندرہ برس بڑے
 تھے یہ بخوار رہے بنیاد بات کہلائی ہے کہ "ایک دفعہ حسنؓ نے عبداللہ بن عمر
 کو غلام زادہ کہہ دیا، انہوں نے باپ سے شکایت کی انہوں نے کہا لکھو والا وہ
 صاحبزادہ لکھ دیا۔ وہ لڑشتہ باپ کے پاس لائے تو انہوں نے کہا اس کو میرے
 کفن میں رکھ دینا یہ سنا ہے۔ غلامی اہل بیت ضمانت جنت ہے" (ص ۵۰)
 کتابچہ نویس کی اس لالی یعنی بکواس کا مقصد نسل پرستی کے شیعہ عقیدے کا اظہار
 ہے مگر کس واپسی طور سے۔ حضرت علیؓ کا فائدہ ان بنی ہاشم اور حضرت عمرؓ کا فائدہ ان
 بنی عدی قبیلہ قریش کے سردار گھرانے میں منسلک تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 بھی لبنا قریشی ہاشمی ہیں۔ قبیلہ قریش اور غیر قریشی عرب تفاخر نسبی میں سب سے
 زیادہ مبتلا تھے، اسلامی تعلیمات نے اس جاہلی فخر کو مٹا کر سب اہل کلمہ کو بھائی
 بھائی بنادیا انہما اہلہ منون اخوة۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
 عظیم خطبہ حجۃ الوداع میں امت کو مختلف نصیحتیں و وصیتیں کرتے ہوئے
 فرمایا تھا کہ نسل و نسب کے اعتبار سے کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی کلمے رنگ
 والے کو کسی گورے رنگ والے پر کوئی برتری و فضیلت نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک
 اکرم وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ اپنی بھولی حضرت صفیہؓ اور اپنی
 صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو نیا طب کر کے فرمایا تھا کہ آخرت میں میرے تمہارے کسی
 کام نہیں آسکتا، تم لوگ عمل نیک کرو وہ ہی تمہارے کام آئیں گے خَا ذَا لَفُیْحٌ

فِي الصُّورِ فَلَا النَّسَابَ بَيْنَهُمْ وَلَا يَنْتَسِبُونَ (سورہ نور) یعنی پھر جب صور بھونکا جائے گا تو ان کے (انسانوں کے) درمیان کوئی رشتہ نہ رہے گا۔ نہ وہ ایک دوسرے سے بات پر چھیں گے۔ نیز فرمایا گیا ہے۔ لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ یعنی تمہارے رشتے اور تمہاری اولاد قیامت کے دن تمہیں نفع نہیں پہنچائیں گے۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ يَأْتِهَا كَيْدًا مِنْ أَلْفِ لُحُوتٍ یعنی جن کا (نیکی کا) پلہ بھاری ہوگا۔ وہ کامیاب ہونگے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے یہ کلمہ لا یعنی منسوب کرنا غلامی اہل بیت ضمانت جنت ہے۔ اس بد گو شیعی کی احمقانہ حسرت ہے۔ شیعہ تحریک حقیقتاً عجمی پیداوار ہے۔ شیعہ اہل عجم کو حضرت مہدی سے خاص عداوت تو اسی وجہ سے ہے کہ آپ ہی کے مبارک ایام خلافت میں ایران فتح ہو کر درفش کاویانی کا پرچم ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہو کر اسلام کا بول بالا ہوا تھا۔ ایک ایرانی شاہ ضیاء گردی ہی نے صحیح بات کہہ دی ہے۔

شکستِ عمرِ پست ہر برانِ اجم را
بر بادِ فنا داد رگِ ورثہ جم را

ایں عریدہ بر غصہِ خلافتِ ز علیٰ منیت

با آلِ عمرہ کینہ قدیم است عجم را

اہل البیت سے کلام اللہ میں مراد صرف اذواجِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

ہی سے ہے سورہ الاحزاب کے چوتھے رکوع میں یا ایہا النبی کہہ کر اذواجِ رسول اللہ ہی سے خطاب ہے ان ہی کو نصیحتیں ہیں اور ان کو جس سے پاک کرنا دعا

ہے۔ ان ہی کو اہل اہلبیت (اہل خانہ) فرمایا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور قرابتدار کے لئے چچا ہوں یا بیٹی یہ قرآنی لفظ استعمال کرنا تحریف معنوی کے مرادف ہے۔ بیٹی جو ان ہو کر میا ہی جائے وہ اپنے شوہر کی اہلبیت ہوگی نہ کہ اپنے والد کی اہلبیت کہلا سکے گی۔

اس کتاب سیرۃ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے فاضل مؤلف نے مورخانہ معیار تحقیق و ریسرچ سے امام صاحب کے مذہب و مسلک کے سرسلسلہ کو بالوضاحت بیان کر کے ان اکاذیب و خرافات کی حقیقت عیاں کر دی ہے جو اموی و عباسی خلافت کے مخالفین نے امام صاحب کے وقائع زندگی کے سلسلے میں اپنے ذہن سے تراش تراش کر منتشر کیں۔ شیعہ کتابچہ نویس ایک طرف تو امام اعظمؒ کو مذہباً شیعہ بتاتا ہے، پھر یہ بکواس بھی کرتا ہے کہ قاضی ابو یوسفؒ نے ایک مکمل ذقہ تیار کر کے اپنے استاد ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب کر دیا اور فقہ حنفی وجود میں آکر حکومت عباسیہ کا قانون بن گئی۔ اور پانچ سو برس تک اسے حکومت کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس وجہ سے کثیر التعداد مسلمان اس کے پیرو ہو گئے ورنہ ابو حنیفہؒ کی نہ کوئی فقہ ہے نہ وہ کسی مدرسہ فقہیہ کے بانی تھے نہ انہیں اپنی زندگی میں کوئی ایسا امتیاز حاصل تھا۔

”قاضی ابو یوسفؒ نے ابو حنیفہؒ کو امام اور مجتہد بنا دیا ورنہ کوئی انہیں جانتا بھی نہیں“ (صفحہ ۱) اس متعصب شیخہ کو کیا معلوم کہ اسلام کے مشہور اماموں میں کسی کے اتنے اصحاب و شاگرد نہیں ہوئے جتنے امام ابو حنیفہؒ کے ہوئے۔ فاضل مؤلف کتاب نے چند جلیل القدر شاگردوں کے حالات یہی بیان کر دیئے ہیں۔ امام الکردریؒ نے سات سو تیس مشاہیر علمائے کرام کے نام بقید نام و نسب لکھے ہیں جو مختلف دیا و امصار میں آپ کے شاگرد تھے۔

علامہ ابن النیم نے اسی ہمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔
 العلم یبداً وبحراً شرقاً وغرباً یعداً او قسراً یا تدویناً رضی
 اللہ عنہ یعنی دور و نزدیک مشرق و مغرب اور خشکی و تری میں (ابوصنیفہ)
 ہی کا علم پھیلا تھا (لفہرست صفحہ ۲۰) شیعوں کے کسی امام کے علمی وسعت کا
 ایسا کوئی تذکرہ کہیں نہیں نہیں الغرض فاضل مولف کی یہ کتاب حضرت امام اعظم
 ابوصنیفہ کے سوانح حیات اور آپ کے کمال قدر علمی خدمات کا جو خلاصہ عباسی
 کے ایما اور سرپرستی میں انجام دین آئی ہے۔ محبت مکرم جناب عبدالعزیز
 صاحب کانپوری انجینئر (فردوس کالونی) اور بعض دوسرے صحیح العقیدہ مخلص
 صاحبان کا شکریہ واجب ہے۔ جن کے تعاون و ہمت افزائی سے یہ کتاب
 منظر عام پر آسکی۔

احقر

محمود احمد عباسی

کراچی

۲۲ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ

۳۰ نومبر ۱۹۷۰ء عیسوی۔

پیش لفظ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى مُحَمَّدٌ خَيْرُ الْوَرَى
 وَخَلْقَانِهَا أَعْلَامُ الْهُدَى - أَمَّا بَعْدُ

اہل پاکستان کی غالب اکثریت حنفی المذہب ہے لیکن امام اعظم
 ابو حنیفہ کے متعلق عہد حاضر کے جن اہل قلم نے کتابیں لکھیں، کتابچے شائع کئے
 اور اخباروں، رسالوں میں مضامین طبع کرائے ان میں بلا تحقیق ایسی باتیں
 لکھیں جو عقلاً و نقلاً قابل قبول نہیں۔ یہ غلطیاں زیادہ تر تاریخی اعتبار سے
 ہیں۔ آپ کی شخصیت، میلان طبع اور مواقف اور پھر آپ کے سلسلہ تلمذ کے
 بارے میں بے پایا اور خلاف واقعہ باتیں لکھ کر بعض لوگوں نے یہاں تک ثابت
 کرنے کی کوشش کی کہ آپ شیعہ تھے۔ یا شیعیت کی طرف رجحان رکھتے تھے
 نرم سے نرم بات یہ کہی گئی ہے کہ آپ کی ہمدردیاں آل علی میں سے ان حضرات کے
 ساتھ تھیں جو وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلاف کھڑے ہوئے۔

اس خود ساختہ نظریے کے تحت یہ بھی ثابت کرنے کی سعی لاحقہ حاصل کی
 گئی ہے کہ حضرت امام کے نزدیک گویا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کا قائم کردہ نظام خلافت صحیح نہیں تھا۔ یعنی خلفائے اسلام کی یہ حیثیت نہ
 تھی کہ ان کے ساتھ تعاون کیا جائے اور شرعی بنیاد پر انھیں امام تسلیم کر کے

ان کی اطاعت کی جائے۔ حضرت امام کی طرف یہ تصور منسوب کر کے ایسی فضا قائم کی گئی ہے کہ خلق اور بھی گویا ان سے اور ان کے شاگردوں سے کھٹکتے تھے، انھیں ایذا میں دیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ان حضرات کے نظریات اُمت میں پھیلنے نہ پائیں۔

یہ سب باتیں حالات واقعہ ہیں۔ اس سلسلے میں صدیوں بعد کے راویوں کی غلط بیانیوں پر تکیہ کیا گیا ہے، اور جن غیر محتاط مصنفوں نے اپنی کتابوں میں یہ بے حقیقت باتیں درج کر دیں، انہی کو عہد حاضر کے لوگ اپنا ماتحت بنا کر بے سوچے سمجھے یا بالفصد ایک منصوبے کے تحت نقل و نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگر متقدموں کی کتابیں اور قریب العہد مصنفوں کی تحریریں سے بعد کے لوگوں کی روایات کا مقابلہ کر لیا جاتا، تو صحیح صورت حال سامنے آجاتی علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ حضرت امام مجتہد مطلق ہیں اور اُمت کی غالب اکثریت ان کے اجتہاد پر عمل کرتی ہے۔ اس لئے ان اہل تصنیف کی حقانیت کا تقاضا تھا کہ وہ حضرت امام کے شاگردوں اور متوسلوں کے موقف پر بھی نگاہ ڈالیں اور غور کرتے کہ جو باتیں امام صاحب کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں وہ ان کے کھلے ہوئے دُورِ مذہب سے بھی مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں۔

مستبر ترین مآخذ کی روشنی میں جو باتیں سامنے آتی ہیں اور امام صاحب کے مذہب سے یدابہتاً عیاں ہیں، ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب پوری طرح جماعت سے والیتہ تھے، شیعیت کی ان میں رمت بھی نہ تھی، اور تعلیمات نبویہ کے مطابق وہ اجماع صحابہ کو حجت شرعیہ جانتے تھے جماعت اور اس کے امام سے وابستگی ان کے نزدیک قرآنِ مجید میں کھنی خلیفہ وقت کی اطاعت اور اس کے ساتھ تعاون، ان کی زندگی کا اصول

تھا، وہ کسی درجے میں بھی امام جماعت کے خلاف خروج و بغاوت کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

لوگوں نے فرقہ وارانہ اور نسلی جذبات کے تحت یہ تصور دلوں میں جاگزن کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے ائمہ اور خلافت قائمہ کے درمیان دوئی تھی اور خلفاء کرام اپنے اپنے عہد کے علماء و فقہاء پر حریفانہ نگاہ ڈالتے تھے یعنی وحدت امت مفقود تھی اور بجائے اس کے کہ تمام انفرادی و اجتماعی امور ملیہ خلیفہ و امام وقت کی قیادت میں انجام پائیں۔ صورت یہ بتائی جاتی ہے کہ امت کی قیادت بٹ گئی تھی۔ علماء و فقہاء عوام کو ایک راہ لگانا چاہتے تھے اور خلفاء دوسری راہ پر۔

گویا اس طرح ایک طرف تو یہ جتایا گیا کہ امت سیاسی معاملات کے لیے نیاز ہو گئی تھی۔ اسے پروانہ رہی کہ حکومت وقت کیسی ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں، اور دوسری طرف اس کی شہرت دی گئی کہ خلفاء بھی من مانی کرتے تھے۔ امت کی فلاح و بہبود سے انہیں بے غرض نہ تھی، جو رواستہ پران کا مدار تھا۔ کیونکہ علماء و فقہاء نے یہ وتیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ خلافت قائمہ سے عدم تعاون کریں، ان کے متاصہب قبول کرتے پر تیار نہ ہوں، اور موقعہ بے موقعہ ان کی مخالفت پر ڈٹے رہیں۔

چنانچہ جو ائمہ فقہ و حدیث امت میں اپنا مقام رکھتے ہیں ان کے متعلق عموماً ایسی روایتوں کو شہرت دی گئی جن سے معلوم ہو کہ وہ حکومت کی اطاعت واجب نہیں جانتے تھے۔ اور حکومت بھی ان پر ظلم و ستم توڑتی رہتی تھی۔ یہ سب خیالی فصاحت اس لئے قائم کی گئی ہے کہ اس سیاسی نظام کی حیثیت شرعی نہ رہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے اجماع

سے قائم کیا تھا۔ اور امت اسی نظام کی جو گر ہو گئی تھی۔

پھر جن علماء و فقہاء کو حکومت کے متناصب پر دیکھا اور امت میں ان کی مقبولیت پائی۔ یا تو ملت کے اندرونی دشمنوں نے ان کی علمی اور روحانی عظمت کم کرنے کے لئے انہیں خلفاء کا آلہ کار بنانے کی کوشش کی یا جب اس طرح کام چلتا نظر نہ آیا تو بیان کیا کہ خلفاء تو ان پر رعب حکومت ڈالتے تھے۔ مگر وہ ان کا رعب مانتے نہ تھے اور ان کے سامنے کلمہ حق کہہ کر جہاد اکبر کرتے رہتے تھے۔ یعنی ائمہ فقہ و حدیث اور خلافت قائمہ کے درمیان ہمیشہ خلفاء قائم رہا اور باہمی تعاون و احترام و یک جہتی کے ساتھ فرائض ادا کرتے گئے۔ سبیل نہ رہی۔

گویا جس امت کو خدا تعالیٰ نے خیر امت قرار دیا ہے، اہل عالم کیلئے نمونہ بنایا ہے اور اسے بشارت دی ہے کہ اسے صراطِ مستقیم پر قائم رکھے گا وہ امت ان کے خیال میں آج تک شر امت چلی آتی ہے۔ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دامن سے وابستہ جماعت المسلمین سب کا ایک ہی حال تھا۔ یعنی وہ زمانہ جو خیر القرون کہلاتا ہے اور جو ۲۵ھ میں ختم ہوا، اسی مدت میں دین مسخ ہو گیا، امت گم راہ ہو گئی اور بقول موردی صاحب اس کی قیادت شکستہ کے بعد جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس تصور کے باوجود دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دین اسلام ایک زندہ و پائندہ تحریک ہے۔ جس کا نور پورا ہو کر رہے گا۔ اگرچہ کافروں کو ناگوار ہو۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آخری امت کی فطرت ہی ایسی رکھی ہے کہ یہ کبھی غلط بات پر مجتمع نہیں ہوتی۔ اور یہ ناممکن ہے کہ

کوئی غلط رو شخص اپنے ”نسب و علم و تقدس“ کے دام میں اسے پھنسا کر یہ جب مجتمع ہوگی تو اس نظر سے پر جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا۔ اور جس میں امت کی قلاح ہوگی۔ اسی کا نتیجہ نکلا کہ ایک صدی کے اندر اندر یہ امت تین چوتھائی متمدن دنیا پر چھا گئی اور تیسری صدی کے نصف سے پہلے پہلے اہل عالم پر اپنا ذہنی اور روحانی تفوق اس طرح ثابت کر دیا کہ زندگی کے ہر نظام اور اسی کے مقرر کردہ منہاج کی پیروی کر کے دنیا کے لوگ کامیاب ہو رہے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری جو تاریخ امت کا سیاہ ترین دور ہے اور جس میں عجی طاقتوں نے سیاسی تفوق حاصل کر کے دین مبین کو مسخ اور دعوت محمدیہ کو فنا کرتے کی کسی سازش سے دریغ نہیں کیا، وہ اپنی کوششوں میں اسی لئے پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے کہ مسلمانوں نے خیر القرون ہی میں اپنا دین مدون و محفوظ کر لیا تھا اور اپنا لائحہ عمل لایا رکھا تھا کہ ہر تحریکی تحریک فنا کے گھاٹ اترتی رہی اور امت کی مجموعی قوت لے رہ رہ کر غلبہ حاصل کر لیا۔

تاریخ اسلام کی یہی روئداد ہے۔ اسی لئے ملت کے اندرونی دشمنوں نے عاجز آ کر تصنیف و تالیف کا سہارا لیا اور روایات و اہمہ کی بھرمار کی اپنی سیاسی شکست کا بدلہ لینا چاہا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ ہے۔ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی کرامت کہ ایسی جتنی بھی روایتیں ہیں ان میں قدرتی تضاد پیدا ہو گیا۔ اور اس طرح ان روایات کی اندرونی و بیرونی شہادتیں ان کے لیے پایہ ہوتے کی متہ یولی تصویریں بن کر ابھرتی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالم مناظر احسن گیلانی مرحوم جنہوں نے
 امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی لکھی، یا مودودی صاحب جنہوں نے
 حال ہی میں اپنی رسوائے زمانہ کتاب "تلافت و بلوکیت" لکھ کر امت پر
 اور خود اپنے اوپر ظلم عظیم کیا ہے، یا مصر کے مشہور مصنف شیخ ابو زہرہ نے
 جنہوں نے ائمہ اربعہ پر کتابیں لکھیں، ان میں کسی نے ان ائمہ کی شخصیتوں
 اور ان جیسی غیر سیاسی اور علمی ہستیوں کے "سیاسی" مواقف پر تبصرہ کرتے
 تحقیق سے قطعاً کام نہیں لیا۔ بلکہ درایت سے منہ موڑ کر صدیوں بعد کے غیر مختص
 مولفوں کی متضاد خرافات پر تکیہ کر کے وہ باتیں ان بزرگواروں کی طرف
 منسوب کر دیں جو کسی طرح تاریخی حیثیت سے ثابت نہیں کی جاسکتیں۔
 مصر کا عالم احمد امین کا بھی اس سلسلے میں بڑا مقام ہے انہوں نے
 امت کے ثقافتی ارتقاء و زوال پر فخر الاسلام، ظہر الاسلام وغیرہ کتابیں
 لکھیں۔ ان کا طبع نظر تو ادب تھا۔ مگر دوسری باتیں بھی آگئیں ہیں۔
 عہد حاضر کے ذہنی جمود بلکہ پستی کے زمانے میں شخص واحد کا اس طرح کام
 کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن افسوس کہ تاریخی امور میں ان کا زیادہ
 انحصار الاغانی پر ہے جس میں رطب و یابس بلکہ بے پایہ روایتوں
 کی اتنی کثرت ہے کہ اہل تحقیق کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں اور وقائع
 تاریخیہ میں اس سے لے جایا استناد کسی درجے میں درست نہیں سمجھا جا
 سکتا۔ صاحب کتاب اگر چہ نسباً اموی ہیں۔ لیکن شیعہ المشرک آلِ حمدؑ
 کے دربار سے وابستگی کے سبب وہ غلط راہ پر پڑ گئے اور ایسی لغو باتیں
 لکھ گئے جن کی رکالت عیاں ہے۔ اس کے باوجود احمد امین نے جگہ جگہ
 الاغانی سے استناد کیا ہے۔

عوام کو فقہی آراء اور مذہبی نکات سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی
ائمہ کی شخصیتوں کے ذاتی اور صفاتی احوال سے۔ اس لئے ملت و وفاداری
کا تقاضا ہے کہ ان حضرات کے بارے میں مقدور کھیر تحقیق کر کے بات کہی
جائے۔ تاکہ ان کے حقیقی خط و حال نمایا ہوں۔ ہمارے پیش نظر جو تک
اس وقت صرف امام اعظم ابوحنیفہؒ کی شخصیت ہے۔ اس لئے ہم
ان فضولیات اور لغویات کی تفتیح کرنا چاہتے ہیں۔ جو بے احتیاطی سے
یا اپنے مقصدانہ عزائم کے تحت لوگوں نے لکھ ماری ہیں اور برابر انھیں
شہرت دے رہے ہیں حتیٰ کہ امام صاحب کو شیعیت سے متہم کر کے
کی لغویاتی کی جسارت بھی کی گئی ہے۔

علی احمد عباسی
سید و شریف سوات

شخصیت امام اعظم ابو حنیفہ

نام و نسب :- امام صاحب کا خاندان عجمی الاصل ہے، عرب خاندان تميم اللات سے جو قبائل انحرزج (انصار) سے کوثر میں مسکن گزین تھا۔ ان کا رشتہ "ولاء" تھا۔ ولایتین معنی کے لئے مستعمل ہے ایک یہ کہ آدمی جنگی قیدی بن کر آئے اور وہ ایسا ہو کہ اسے احسان رکھ کر چھوڑا جاسکے اور نہ فدیہ لے کر۔ پھر دشمن اسے تیار دلے میں واپس لینے پر بھی تیار نہ ہو۔ ایسے جنگی قیدیوں کو مختلف مجاہدوں کا مملوک بنا دیا جاتا تھا۔ اور ملکیت میں دیتے وقت آقا اور مملوک دونوں کی معاشرتی حیثیت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ قانوناً یہ مملوک اپنے آقاؤں کے گھر والوں ہی کی طرح ہو جاتے تھے، ان کے کھاتے پینے کا انداز حکماً وہی رکھا جاتا تھا جو گھر والوں کا ہو۔ اگر ان کا آقا انھیں آزاد کر دے تب بھی یہ اسی خاندان کے وابستہ رہتے تھے۔ اور اسی قبیلے میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اور یہ موالی کہلاتے تھے۔ "ان موالی القوم منہم" (ایک قوم کا موالی انھیں میں ہوتا ہے) امام صاحب کے خاندانی ولاء کی یہ صورت نہ تھی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ غیر عرب آزاد قبائل کو امیر المؤمنین اپنی ذاتی سرپرستی میں لے لیں جیسے امیر المؤمنین ہشامؒ نے بعض قبائل عجم کو یہ شرف بخشا تھا۔ اور وہ موالی امیر المؤمنین کہلاتے تھے۔ امام صاحب کی ولاء اس معنی میں بھی نہ تھی۔

تیسرا دستور تھا کہ آزاد غیر عرب کسی عربی قبیلے میں رضا کارانہ شامل ہو جاتا تھا۔ اور وہ قبیلہ اسے اور اس کے خاندان کو قبول کر لیتا تھا۔ حضرت امام صاحب کی ولایت اسی قسم کی تھی۔ آپ کے دادا زوطی نے پتہ رشتہ ولایت قبیلہ تلحہ اللات سے استوار کر لیا تھا۔ جن کا خاندان کوفہ میں سکون گزین تھا۔ اس طرح ان کے حقوق وہی ہو گئے جو اس قبیلے کے تھے۔ یہ صورت عرب و عجم کا فرق مٹانے کی تھی۔

امیر المؤمنین حضرت عمر الفاروقؓ کے عہد مبارک میں جب دیوان رتبہ ہوا، اور تمام قبائل کے سرکاری وظائف تجویز کئے گئے تو جو لوگ بالولایت کسی قبیلے میں شامل ہو گئے تھے ان کے وظیفے کا معیار بھی وہی رکھا گیا جو اس قبیلے کا تھا۔ امام شافعیؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب لآہم میں اس کی بعض تفصیلات دی ہیں۔ (جلد ۱، صفحہ ۵۸ طبع مصر، مکتبۃ الانوار) دیوان کا یہ نظام خلافت اسلامیہ میں صدیوں قائم رہا۔ امیر المؤمنین المہدی عباسیؒ کے زمانے تک باقی رہتے کا دستاویزی ثبوت الہم کی یہی روایت ہے۔

حملوں کو سرکاری وظیفہ نہیں ملتا تھا، کیونکہ ان کے تمام اخراجات ان کے آقاؤں کے ذمے تھے۔ لیکن امیر المؤمنین عثمان الشہید الاکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر ولید بن عقیہ کی گزارش پر حملوں کا بھی سرکاری خزانہ سے وظیفہ مقرر کر کے ان کی معاشرتی حیثیت بڑھا دی۔ طبری نے یہ بات امام شعبیؒ کے حوالے سے بیان کی ہے۔

امام صاحب کے نسب کے سلسلہ میں آپ کے ہدیہ رگوار زوطی تک سب کا اتفاق ہے۔ اس سے آگے جو کہا گیا وہ بے ثبوت ہے۔ بعض لوگوں نے

زوطی) کے یاب دادا کو مسلمان اور عرب ثابت کرنے کے لئے آپ کا نسب نامہ
اس طرح مرتب کر ڈالا۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن یحییٰ بن
زید بن ثابت الانصاری التیمی تیم بن ثعلبہ۔ راسم
المصیب فی الرد علی الخطیب ص ۳۷ طبع دیوبند لیکن یہ محض اندھی
عقیدت کی کرشمہ سازی ہے اور کسی درجے میں مستحسن نہیں۔
امام طحاوی نے مشکل الآثار میں امام صاحب کا بالوالا تیمی ہونا
خود ان کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے۔

قال ابو عبد الرحمن المقدی
اثبت ابا حنیفة فقال لی
من الرجل؟ فقلت من رجل
من الله علیه بالاسلام
فقال لی لا تقل هکذا و
لکن وال بعض هذه الاجا
ثم انتم الیهم فانی کنت
انا کذاک۔

ابو عبد الرحمن مقلدی کہتے ہیں کہ میں
ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا اپنے
پوچھا ”کون ہو تم“ میں نے عرض کیا
ایک شخص حبیر اللہ نے اسلام کو ذریعہ
احسان کیا ہے یعنی نو مسلم آپ نے
فرمایا ”یوں مت کہو“ بلکہ ان عرب
قبیلوں میں کسی سے رشتہ ولاء
تاکم کر لو اور پھر تم لوگ انہیں میں
ہو جاؤ گے خود میں بھی ایسا ہی تھا۔

گویا تیم اللات سے آپ کی نسبت ولاء کی تھی، نہ کہ تیم بن ثعلبہ سے
نسبی۔ اور صحیح طریقہ لکھنے کا یہ ہے ”التیمی بالمولاء“ ویسے اللہ تعالیٰ
نے آپ کی جو شرف عطا فرمایا ہے اور جس رفعت سے نوازا ہے وہاں نسب
کی کیا حاجت۔ آپ کے دادا زوطی اسلام لائے تھے اور ان زوطی کے دادا
کا مسلمان یا عرب ہونا قطعاً غلط ہے۔ کونے میں آنے والے آپ کی پہلے

زرگ بھی زوطی تھے۔ اور یہ وہ وقت تھا جب امیر المؤمنین علیؑ نے مدینہ کے بجائے اس بستی کو اپنا دار الخلافہ بنالیا تھا۔ اس طرح یہ طبعی بات تھی کہ جناب زوطیؑ کو حضرت علیؑ سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ اکھوں نے اپنے فرزند ثابتؑ کو امیر المؤمنین کی خدمت میں پیش کیا تھا اور اپنے ان کو لئے دعائیں کی تھیں۔ ان ہی ثابت بن زوطی کے فرزند جناب نعمان (ابو حنیفہ) تھے۔

حیثیت عرفی طبقے کے اعتبار سے امام صاحب صفارتا بعین میں ہیں متعدد صحابہ کرام کی آپؑ نے زیارت کی تھی، مگر تمام علم آپؑ کا کیا تابعین کے فیوض پر مبنی ہے۔ تاریخ بغداد میں ہے جلد ۴ ص ۳۳۳

دخل ابو حنیفۃ یوماً علی المنصور
وعندہ عیسیٰ بن موسیٰ فقال
للمنصور ہذا عالم الدنیا
الیوم۔ فقال لہ یا نعمان
عن اخذت العلم قال عن
اصحاب عمر عن عمر، وعن
اصحاب علی عن علی وعن
اصحاب عبد اللہ عن عبد
اللہ وعن اصحاب ابن عباس
عن ابن عباس وما کان فی
وقت ابن عباس علی وجہ
ایک دن ابو حنیفہؑ (تخلیفہ) المنصور
کے پاس آئے وہاں عیسیٰ بن موسیٰ عباسی
بھی تھے اکھوں نے المنصور سے عرض
کیا، آج ساری دنیا میں یہ سب بڑے
عالم ہیں (تخلیفہ المنصور) نے پوچھا نعمان
تم نے علم کہاں کہاں حاصل کیا، عرض کیا
اصحاب عمر سے عمر کا، اصحاب علی سے
علی کا، اصحاب عبد اللہ بن مسعود سے
عبد اللہ کا اور اصحاب ابن عباس سے ابن
عباس کا، اور ابن عباس کے وقت میں
روسے زمین پر ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔

الارض اعلم منه قال لقد استوثقت لنفسك
فرمایا تم نے اپنے نفس کی تکمیل بہت مضبوطی سے کی ہے۔

اسی طرح ”دیار پکری“ کی تاریخ خمیس میں ہے (ص ۱۲۴ طبع اولیٰ)
۳۰۲ھ

قال ابو حنیفۃ دخلت علی ابی جعفر امیر المؤمنین فقال لی
عن اخذت العلم؟ قال قلت
عن حماد عن ابراهیم عن
عمر الخطاب وعن علی بن ابی طالب
وعبد اللہ بن مسعود وعبد
اللہ بن العباس قال یحییٰ بن
استوثقت ما شئت یا ابا
حنیفۃ الطیبین الطاہرین
المبارکین، رضی اللہ عنہم
راہم) ابو حنیفہ فرماتے ہیں میں ابو جعفر
راہ المنصور امیر المؤمنین کی خدمت میں
حاضر ہوا، اکھڑوں نے پوچھا ”تم نے علم
کہاں حاصل کیا ہے؟ میں نے عرض کیا
امام حماد سے اکھڑوں نے امام ابراہیم سے
اکھڑوں نے امیر المؤمنین عمر بن الخطاب
سے راہ المؤمنین علی بن ابی طالب سے
حضرت عبداللہ بن مسعود سے اور حضرت
عبداللہ بن عباس سے، فرمایا واہ واہ
ابو حنیفہ تم نے تو اپنا مقصد بختگی کے ساتھ
بڑے خوب و پاک اور مبارک حضرات سے
حاصل کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب سے
راضی ہو۔

یہ صورت حال ان دونوں عظیم سہتیوں کی پہلی ملاقات کی ہے اس سے
بھی واضح ہوا کہ امام صاحب کو صحابہ کرام کی بجائے ان کے اصحاب سے فیض
ہے۔ ویسے آپ نے جن صحابہ کرام کی زیارت کی، ان کی وفات ایسے زمانے میں
ہوئی کہ حضرت امام ان سے بخوبی استفادہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ بعض لوگوں

نے ان اصحاب سے آپ کی بلا واسطہ روایتیں نقل بھی کی ہیں، لیکن ان کا ثبوت نہیں اور نہ امام صاحب نے ان سے اپنی کوئی روایت بیان کی ورنہ کتاب الآثار جو آپ کے شاگردوں نے آپ سے روایت کی ہے اس میں کچھ تو اشارہ ہوتا۔

وجہ یہ ہے کہ معمر صحابہ اپنے آخری زمانہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد نقل کرنے سے گریز کرتے تھے کہ کہیں امتداد زمانہ کے سبب کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کے یہاں روایت بیان کرنے کی شرط بڑی سخت ہے۔ وہ صرف ایسی روایت بیان کرتا جہاں سمجھتے ہیں جو بالکل اسی طرح یاد ہو جس طرح پہلی دفعہ سنی۔ امام طحاویؒ نے بستمہ متصل لکھا ہے۔

قال ابو حنیفۃ لا ینبغی للرجل ان یحدث من الحدیث الا بما حفظہ من یوم سمعہ الی یوم یحدث بہ

ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ کسی شخص کو کوئی حدیث بیان کرنی جائز نہیں جب تک اسے روایت کرتے وقت بالکل اسی طرح یاد نہ ہو جس طرح پہلی مرتبہ سنی تھی

وہ تو اس بارے میں اتنے سخت ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی روایت دیکھے جو اسے پہلے سے زبانی یاد نہ ہو تو وہ اس کی روایت کی بھی اجازت نہیں دیتے (الکفایہ فی علم الرجال) ص ۳۱۲ طبع حیدرآباد دکن) بہر حال امام صاحب نے جن صحابہ کی زیارت کی وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مدینہ طیبہ:- حضرت سہیل بن سعد الساعدی (رم ۹۸ھ) مدینہ طیبہ میں وفات پانے والے آخری صحابی رضی اللہ عنہ

(۲) بصرہ :- حضرت انس بن مالک (رم ۸۷ھ) بصرہ میں وفات پاتے والے آخری صحابی۔ امام صاحب نے ان کی زیارت متعدد بار کی رضی اللہ عنہ۔

۳۔ کوفہ :- حضرت عبداللہ بن ابی اوفی (رم ۸۷ھ) کوفہ میں پاتے والے آخری صحابی۔ یہیں صفار صحابہ میں ابو الطفیل عامر بن واثلہ کو بھی (رم ۸۷ھ) رضی اللہ عنہ۔

بعض لوگوں نے دوسرے صحابہ کے بھی نام لئے ہیں۔ لیکن انکی زیارت ثبوت مشکل ہے۔ کیونکہ امام صاحب بعہد امیر المؤمنین عبدالملک بن مروان پیدا ہوئے تھے۔ جو صحابہ اوپر مذکور ہوئے ان کی زیارت کر سکتے تھے اور ان سے روایت کا بھی امکان تھا۔ لیکن حضرت عبداللہ بن احمارت جزالہ بصری (رم ۸۶ھ) جو مصر میں وفات پاتے والے آخری صحابی ہیں اور وہیں رہتے تھے، یا حضرت جابر بن عبداللہ انصاری (رم ۸۷ھ) کی زیارت کا بھی امکان نہ تھا۔ چہ جائیکہ ان سے بلا واسطہ روایت کریں۔ البتہ حضرت یحییٰ بن معینؒ نے جو جرح و تعدیل کے امام ہیں آپ سے روایت سیدہ عائشہ بنت عمارؓ سے سنتے کی توثیق کی ہے اور یہ بڑی سہولت ہے۔ لیکن امام صاحب کے اپنے شاگردوں نے آپ کی جو مرویات نقل کی ہیں وہ کسی صحابی سے نہیں ہیں بلکہ تابعین سے ہیں۔ بات وہی معنی ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر صاحب شیخ قاتی کے درجے میں تھے، اکھبرا خود ارشادات نبویہ نقل کرنے سے احتراز تھا۔ اور دوسرے امام صاحب کو اہل روایت کے سلسلے میں بڑی شدت تھی۔ یعنی آپ نے کچھ سنا ہو تو اسے روایت نہیں کیا۔ ورنہ سات، گیارہ، اٹھارہ اور بیس

کی عمر میں آدھی بخوبی روایت کر سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ زمانہ ایسا ہو کہ
اصحاب پاک دنیا سے اکٹھے چارہے ہوں و زمانہ تو نہایت حرص کے
ساتھ ان کی زیارت کرتے اور ان سے استفادے کا تھا۔

حضرت امام نے جن شیوخ سے استفادہ کیا وہ عموماً ہر قسم کی اندرونی
سیاسی سرگرمیوں سے بے تعلق ہو کر محض علمی زندگی میں غرق تھے
اور حسب تعلیمات ربانیہ (التوبہ، ۱۲۲) اکھنوں نے اپنے آپ کو ترجیح
علوم کے لئے وقف کر دیا تھا اور عملی سیاست میں حصہ لے کر وقت ضائع
کرنے پر تیار نہ تھے۔ یہی مسلک امام اعظمؒ کا تھا۔ آپ نے عملی سیاست
سے کچھ سروکار نہ رکھا، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ عملی زندگی میں نکیوئی
سے مشغول رہتے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ معاش کی طرف سے بے فکر
تھے۔ آپ کے ہاں کپڑے کا کاروبار اتنا وسیع تھا کہ معتدگشتے دور
دور مال لے جاتے تھے، اس آمدنی سے آپ نے تعلیم کی اشاعت کا کام
کیا، جہاں کوئی جوہر قابل نظر آیا، اسے معاش کی طرف سے بے فکر کر کے
تحصیل علم پر لگادیا۔ امام ابو یوسفؒ ایسے ہی خوش بخت حضرات میں تھے۔
کوفہ۔ فتح ایران کے بعد حضرت فاروق اعظمؒ کے فرمان کے مطابق
حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے یہ نیا شہر بسایا، جو عرب و عجم کے درمیان
بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ اور تہذیبوں کا سنگم تھا۔ اسی لئے صحابہ کرامؓ
کی توجہ اس بستی کی طرف بہت تھی۔ تاکہ دین کی جڑیں یہاں مضبوط ہوں
اور تہذیبوں کے تصادم کا نتیجہ تخریبی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بہت جلد
یہ شہر دنیا کے اسلام کا علمی اور تہذیبی مرکز بن گیا۔ اور یہ سب کچھ
اس کے دارا خلافت سے پہلے ہی ہو چکا تھا، حافظ ابوالبشر دولاہیؒ

نے کتاب الکفی والاسماء میں حضرت قتادہؓ کے حوالے سے بیان ہے۔

عن قتادة قال نزل الكوفة
الف وخمسون رجلاً من
اصحاب النبي صلى الله عليه
وسلم واربعة وعشرين
من اهل بدر۔

حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ
فرمایا کہ میں ایک ہزار چالیس
اصحاب رسول خدا صلی اللہ علیہ
وسلم میں سے یہاں تشریف لائے
اور چوبیس اصحاب بدر۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بانی کوفہ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت ہذیفہ بن یمانؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ
برابر بن عاذبؓ وغیرہم کو حضرت فاروق اعظمؓ نے وقتاً فوقتاً یہاں بھیج
تھا، نظم و نسق کے علاوہ یہ حضرات دین کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اور
ان میں سب سے بڑی مسند عبداللہ بن مسعودؓ کی تھی۔

اس کے بعد امیر المؤمنین معاویہؓ کے عہد مبارک و مسعود میں
مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت جریر بن عبداللہؓ نے مستدار شاد سجائی
علامہ ذہبی فرماتے ہیں۔

کوئے میں عبداللہ بن مسعودؓ، عمار بن یاسرؓ، علی بن ابی طالبؓ
جیسے حضرات نیز صحابہ کرام کی کثیر تعداد نے اس شہر کو رونق
بخشی۔ پھر علقمہؓ، مسروقؓ، اور اسودؓ جیسے ائمہ تابعین
ہوئے۔ پھر شعبیؓ، نخعیؓ، حکیم بن عتبہؓ، حماد، ابواسحقؓ
منصورؓ اور اعلمشؓ جیسے ان کے اصحاب ہوئے اور یوں
ابن عفرہ کے زمانے تک وہاں علم کی کثرت رہی یعنی چوتھی

ہدی تک: ابو خنیس الشافعی کا بیان ہے کہ جو عقیلی ہدی
تک وہاں صحابہ کرام کی درسگاہوں کے نشانات باقی تھے قرأتے
ہیں، روضۃ علوم الحدیث ص ۱۹۱

”میں کوئے میں سب سے پہلے سلسلہ میں داخل ہوا۔

ابو حسن بن تقی شیبانی نے مجھے ایک ایک صحابی کی مسجد

دکھائی۔ اور میں ان سب مسجدوں میں گیا۔ اس وقت یہ

مسجدیں مراکز علمی کی حیثیت سے آباد تھیں۔ ہم نے اپنا

کھانا، حضرت زبیر بن عبد اللہ کی مسجد کو بنایا۔“

لہذا، لوگوں کا یہ بیان صحیح نہیں کہ کوئے کی علمی حیثیت دارالخلافہ بننے

کے بعد تھی۔ موقوف اہل سنی لکھا ہے کہ جب حضرت علیؑ کو ذلت شریف ملے

تو وہاں کی مسجدوں کو حضرت عبداللہ مسعودؓ کے تلامذہ سے بھرا پایا۔

لقد ترک ابن ام عبد اللہ

ابن مسعود رضی اللہ عنہ

ہو لا یرجع الی الکوفہ

غرض یہ ہے کہ کوئے کے دارالخلافہ بننے سے پہلے ہی یہ شہر علوم اسلامیہ

کا مرکز بن چکا تھا۔ حضرت علیؑ کا قیام یہاں جتنے دن رہا وہ زمانہ فتنوں

کا تھا۔ اس لئے آپ کے فیوض سے اہل کوئے نے چنداں فائدہ نہیں اٹھایا

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔ (منہاج السنۃ ج ۴، ص ۱۳۷)

حضرت علیؑ کا علم اور آپ کے فقہ

کا ظہور کوئے میں اتنے ہی دن

جتنے دن آپ خلافت کے دوراں

وانما ظہر علم علی وفقہ

فی الکوفۃ بحسب مقامہ

فیہا مدۃ خلافتہ

وہاں رہے۔

پھر فرماتے ہیں۔
فانما كان الغالب عليه في الكوفة
ومع هذا فاهل الكوفة كانوا
يعلمون القرآن والسنة
قبل ان يتولى عثمان فضلا
عن علي۔

ان کے (یعنی حضرت علیؓ) علم کا
ظہور زیادہ تر کوئے میں ہوا۔ مگر
ساتھ ہی یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی
خلافت میں لڑکیاں، وہاں حضرت
عثمانؓ کے خلیفہ ہونے سے بھی پہلے
کتاب سنت کا علم عام تھا۔

ساتھ ہی آپؐ نے وہ بتائی ہے۔ (ص ۱۴۲)

کیونکہ کوئے جو آپؐ کا گھر تھا، وہاں
لوگ ایمانیات، قرآن اور اس کی
تفسیر اور فقہ و سنت کا علم ابن مسعودؓ
وغیرہ کی خدمت میں حضرت علیؓ کی
تشریف آوری سے پہلے حاصل
کر چکے تھے۔

فان اهل الكوفة التي كانت
دارا كانوا قد تعلموا الايمان
والقران وتفسيره والفقه
والسنة عن ابن مسعود
وغیره قبل ان يقدم علي
الكوفة۔

اسی طرح تصریح فرماتے ہیں۔ (ص ۱۵۷)

جب وہ (یعنی حضرت علیؓ) کوئے گئے
تو انکی تشریف آوری سے پہلے ہی اہل
کوئے نے دین کا علم حضرت سعد بن ابی
وقاصؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت
خلیفہؓ، حضرت عمارؓ، حضرت ابو موسیٰؓ

ولما ذهب الى الكوفة كان
اهل الكوفة قبل ان ياتيهم
قد اخذوا الدين عن سعد
ابن ابي وقاص وابن مسعود
وحنيفة وعمار والي موسىؓ

وغيرهم ممن ارسله
عمر الى الكوفة -

وغیرہ حضرات سے حاصل کر رکھا تھا
جنہیں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ
وقتاً کو ذہ بھیجا۔

محض اتنا ہی نہ تھا کہ اہل کوفہ اس علم پر اکتفا کریں جو انھیں کوفہ
میں حاصل ہوا۔ بلکہ وہ مدینہ طیبہ حاضر ہو کر وہاں سے بھی فیض یاب
ہوتے تھے۔ (منہاج السنہ، ج ۲، ص ۱۲۲)

وہ یعنی حضرت ابو عبد الرحمن السلمي
وغیرہ علماء کوفہ مثلاً حضرت علقمہ
حضرت اسود، حضرت عارث لیثی

حضرت زربن حبیش، جن سے حضرت
عاصم بن ابی الجنود نے تجوید کا علم
حاصل کیا، ان حضرات نے قرآن مجید
کا علم حضرت ابن مسعود سے حاصل
کیا تھا اور پھر مدینہ طیبہ جایا کرتے تھے
تاکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ام المومنین
عائشہ رضی اللہ عنہا سے استفادہ کریں۔

هو ريعني ابا عبد الرحمن
السلمي وغيره من علماء
الكوفة مثل علقمة، والاسود
والحارث الكلبی و زربن حبیش
الذي قرأ عليه عاصم بن
ابی الجنود، اخذوا القرآن
عن ابن مسعود وكانوا
يذهبون الى المدينة
فياخذون عن عمر عائشة

مواقف اساتذہ امام عظیم جب تحصیل علم کے قابل ہوئے اور امام
حماد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تو اپنے اساتذہ کرام ہی کے طریقے پر
چلے اور ان اساتذہ کا علم یہ تھا جیسا کہ بیان ہوا۔ کہ جو علوم انھیں کوفہ
کے دارالخلافت سے پہلے حاصل ہو چکے تھے۔ ان میں حضرت علی کے ایام
خلافت سے کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔ اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی

زندگی کے یہ آخری ایام جو کوئی میں گزرے ان کے لئے اتنے پریشان کن تھے اور ایسی ایسی مشکلات سامنے آتی رہتی تھیں جنہیں حل کرنے سے ہی آپ کو فرصت نہ ملتی تھی۔ ان ہنگاموں نے آپ کو ایسا زحج کر رکھا تھا کہ علمی مسند سنبھالنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ گویا اس عرصے میں امام اعظمؒ کے اساتذہ ان سے استفادہ کا جو حقوڑا سا موقعہ ملا اس کی حیثیت ذیلی تھی اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے ارتقا علمی میں حضرت علیؓ کی تشریف آوری کچھ محو ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو علم ان کے پاس پہلے سے تھا اسی پر وہ مطمئن رہے۔ اور فقہ علوی کی حیثیت ان کے ہاں ثانوی رہی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔ (منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۲۰)

واعلم ان اهل الكوفة و اصحاب ابن مسعود كعلقه والاسود و شريح والحارث بن قيس و عبدة السلمي و مسروق و زبیر حبیش اور ابو داؤد وغیرہم، حضرت عمرؓ اور حضرت مسعودؓ کے علم کو حضرت علیؓ کے علم پر ترجیح یا کرتے تھے۔

حضرت شویب جو امیر المؤمنین حضرت علیؓ کے قاضی تھے وہ فقہی مسائل میں اپنا جہاد کام میں لاتے تھے۔ (منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۲۱)

و شریعہ قاضیہ رای قاضی ان کے زبیر امیر المؤمنین علیؓ

امیر المؤمنین علیؑ انما
تفقه علی معاذ بن جبل
یا یحییٰ وکان یناظرہ فی
الفقہ ولا یقلدہ۔

قاضی (حضرت) شریح نے تمام علم
حضرت معاذ بن جبلؓ سے یمن میں
حاصل کیا تھا اور فقہی مسائل میں وہ
ان سے (یعنی حضرت علیؓ سے) مناظرہ
کیا کرتے تھے اور انکی تقلید نہیں کرتے تھے۔

حضرت علیؓ کے ایک دوسرے قاضی حضرت عبیدہ سلمانی کا بھی یہی
حال تھا۔ ان کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ نے کوٹے میں فرمایا میں
پہلے تو ام الولد کو فروخت نہ کرتے کہ سلسلے میں خلفاء پیشین کے مطابق
رائے رکھتا تھا۔ لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ اسے فروخت کیا جاسکتا
ہے۔ اس پر آپ کے قاضی عبیدہ سلمانی نے اٹھ کر کہا، آپ کی جو رائے
جماعت کے ساتھ تھی وہی ہمیں آپ کے اکیلے کی رائے سے زیادہ قابل
قبول ہے۔ آپ نے فرمایا: اچھا تو جیسا دستور چلا آ رہا ہے اسی کو
قائم رکھو۔ مسئلہ یہ تھا کہ جس باندی سے اولاد ہو جائے وہ اپنے
آقا کی وفات پر خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔ اس لئے ایسی باندی رام
الولد کو فروخت نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اولاد ہو جانے سے وہ عملاً
مثلاً آزاد بیوی کے ہو گئی۔ ایسے ہی اور بھی فقہی اور تفسیری مسائل ہیں
جہاں علماء کو فہ نے اپنی انفرادی رائے کے مقابلہ میں اجتماعی مذہب کو
مطابق اپنا دستور العمل رکھا۔

ایک مشکل اور یہ آن پڑی تھی کہ حضرت علیؓ کو جو لوگ گھیرے ہو
تھے وہ آپ کی موجودگی میں بھی غلط بیانی کر بیٹھتے تھے۔ آپ کی رائے
کے خلاف چلتے تھے۔ اور آپ کی طرف وہ باتیں منسوب کر دیتے تھے، جو

آپ کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوتیں اور پھر معلوم ہونے پر آپ کو انکی تردید کرنی پڑتی تھی۔ وقائع تاریخی میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں اس لئے علماء و فقہاء کو فہ آپ سے صرف وہی باتیں لیتے تھے جو خود اپنے کانوں سے سنیں اور ہنگامی احوال کے تحت ایسے مواقع کم ہی ہوتے تھے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اہل کو فہ آپ کے علم سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکے جو ہر امن ماحول میں اٹھاتے، آپ کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں آپ کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ پیش کیا گیا تو آپ نے قلم اٹھایا اور کاٹتے چلے گئے۔ بار بار قرأت کرتے رہے علی نے یہ ہرگز نہیں کہا ہوگا۔ اس مجموعے میں بہت کھوڑی باتیں ایسی رہ گئیں جو حضرت ابن عباسؓ نے آپ کی سمجھیں۔ یہ حال تھا اقوال علیؓ کا امام مسلمؒ نے اپنے مقدمے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ اسی لئے ان حضرات کے ہاں حضرت علیؓ سے سنی ہوئی روایات بہت کھوڑی ہیں اور ایسی کہ ان پر کسی فقہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ چنانچہ بات وہی رہی جو شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ علماء کو فہ کے ہاں حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے ارشادات پر زیادہ تکیہ تھا۔

الشیوخ والفقہاء علوم نبویہ کے حامل دو قسم کے ہوتے ہیں

ایک وہ جو شیوخ کہلاتے ہیں یعنی محدث

اور دوسرے وہ جنہیں فقیہ کہا جاتا ہے۔ شیوخ یعنی محدثوں کا موضوع

یہ ہے کہ حدیث کی روایت کریں، اسناد اور متن کی صحت و سقم سے بحث

کر کے حدیث کا درجہ متعین کریں۔ فقہاء وہ ہیں جو صحیح احادیث کی

روایت کے ساتھ ساتھ، ان سے مسائل و استخراج کریں، خاص

و عام حکم کی پہچان ہو۔ اور تاسخ و منسوخ کا درک رکھتے ہوں۔ کتاب و سنت سے کسی مسئلے پر حریب اپنا مذہب مرتب کریں تو دلائل و براہین سے اسے ثابت بھی کر سکیں۔

چنانچہ جو حدیث شیوخ سے مروی ہو اس کے مقابلہ میں اس حدیث کو ترجیح دیجاتی ہے جس کی روایت فقہا کریں۔ خطیب بغدادی فرماتے ہیں۔ (الکفایہ ص ۳۶) کہ حضرت دکیع نے حضرت علی بن خشرم سے پوچھا تمہیں کونسی سند زیادہ پسند ہے؟
اعمش روایت کریں ابو وائل سے یا
اور وہ عبد اللہ بن مسعود سے یا
سفیان حوالہ دیں منصور کا اور
ابراہیم کا اور وہ علقمہ کا اور عبد اللہ
بن مسعود کا۔ ہم نے کہا "اعمش
کی جو روایت ابو وائل کے ذریعہ ہو
فرمایا سبحان اللہ! اعمش شیخ
ہیں اور ابو وائل شیخ ہیں لیکن
سفیان فقیہ ہیں، منصور فقیہ ہیں
ابراہیم فقیہ ہیں اور علقمہ فقیہ ہیں۔
جو حدیث فقہاء کے ہاں رائج ہو
وہ اس سے بہتر ہے جو شیوخ کے ذریعہ
رواج پائے۔

اعمش جس حدیث کی روایت ابو وائل سے کریں اور وہ ابن مسعود سے

اس میں واسطے کم ہوں گے۔ اور ایسی حدیث کو "عالی" کہا جاتا ہے محدثوں کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے۔ اور وہ کو شش کر تے ہیں کہ انھیں "عالی" حدیث ملے۔ سفیان سے حضرت ابن مسعود تک واسطے زیادہ ہیں، مگر راویوں کے فقیہ ہونے کے سبب اسے ترجیح دی جائے گی، کیونکہ اسے ان حضرات نے روایت کیا ہے جو دین کے نکات پر عبور رکھتے ہیں۔

یہ وکیع "دم شامہ" امام اعظم کے اجلہ تلامذہ میں ہیں اور امام اعظم امام شافعی اور حضرت امام احمد کے اجلہ اساتذہ میں۔ حدیث کے بارے میں ان کا بیان حجت مانا جاتا ہے۔ یہیں امام اعظم اور ان کے تلامذہ کا طریقہ کار معلوم کیا جاسکتا ہے کہ تحصیل علم کے لئے کن حضرات سے استفادہ انھیں عزیز تر تھا۔ حضرت امام کے شیوخ کی تعداد چار ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ لیکن اساتذہ سے کہتے ہیں جس کی حدیث میں انسان ایک غصے تک حاضر رہا ہو۔ کسی صنف علم میں اس سے تربیت حاصل کی ہو۔ اور خود جب درس دینے بیٹھے تو اس کے اقوال سے استفادہ کے ساتھ اپنے اجتہاد کی قوت بھی اس کے مذہب سے ثابت کرے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضرت امام کا عمومی رجحان اپنے اساتذہ کرام کی طرح فقہ فاروقی امام ابن مسعود کی طرف ہوتا چاہئے۔ اور واقعی سمجھا بھی، جیسا کہ ان اپنے بیانات اور ان کے مرقوں مذہب سے عیاں ہے ایسا ہونے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ انھوں نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے خاص فیض اٹھایا تھا اور وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن

عباسؑ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اور یہ دونوں بزرگوار وہ ہیں جنہیں شرف صحابیت کے ساتھ یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ نبیوں فاروقی سے بہرہ وافر رکھنے کے سبب ان کا شمار امت کے عظیم ترین فقہاء میں ہوا۔ اب بعض لوگ بیان کرتے ہیں اور بلا تحقیق بڑی سختی سے کہ حضرت امام اعظمؒ نے جناب محمد راباقرؒ اور ان کے فرزند جعفر الصادقؒ سے باقاعدہ تحصیل علم کی تھی۔ اور ان دونوں کے علاوہ عبید اللہ المحض اور زید بن علی بن الحسینؒ سے بھی انھیں خاص فیض تھا۔ اسی لئے ان کے اندر شیعیت کی طرف میلان پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بیان جس کسی کا بھی ہو از سر تا پا غلط ہے۔ اس سلسلہ میں شیخ الاسلام بن تیمیہؒ فرماتے ہیں (منہاج السنہ ج ۴، ص ۱۲۳)

ان هذين اهل الكذب الذي يعرف من له ادنى علم فان ايا حنیفة من اقرات جعفر الصادق، توفي الصادق سنة ثمان و اربعين وتوفي ابو حنیفة سنة خمسین ومائة و كان ابو حنیفة یفتی فی حیوة ابي جعفر والصادق وما یعرف ان ایا حنیفة اخذ عن

یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جسے ادنیٰ علم کا آدمی بھی جانتا ہے، کیونکہ ابو حنیفہ تو جعفر الصادقؒ کی ہم طبقہ ہیں۔ صادقؒ کی رحلت ۸۵ھ کی ہے اور ابو حنیفہ نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ ابو حنیفہؒ تو صادقؒ کے والد ابو جعفر کے زمانہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اور ایسی کوئی بات معروف نہیں کہ ابو حنیفہ نے جعفر الصادقؒ یا ان کے والد سے کوئی ایک مسئلہ بھی لیا ہو۔

جعفر الصادق ولا عن
ابیہ مسئلۃ واحداۃ
بل اخذت عن کان اسن
منہما لعطاء بن ابی رباح
وثبتہ الاصلی حماد بن
ابی سلیمان۔

بلکہ انھوں نے علم ان بزرگواروں سے
حاصل کیا جو ان دونوں سے زیادہ
معتمد تھے جیسے عطاء بن ابی رباح
اور ان کے اصل استاد امام حماد
ابن ابی سلیمان؟

رہی یہ بات کہ محمد الباقرؑ عبداللہ المحض یا جعفر الصادقؑ اور زید
بن علی بن حسینؑ وغیرہم سے ان کی صحبتیں رہی ہوں، علمی مذاکرات ہوئے ہوں
تو کچھ بعید نہیں، کیونکہ یہ حضرات مدینہ طیبہ میں رہتے تھے، اور امام اعظمؑ
جب حج کے موقع پر حرمین شریفین حاضر ہوتے ہوں گے تو ان سے ملاقات
بھی کرتے ہوں گے۔ ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم بھی ہوتی ہوگی جو اصحاب
علم کا شعار ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی کیسے ہو گئے۔ کہ امام صاحب نے
اپنے ان ہم عصر حضرات سے افتد علم کیا اور اس تعلق سے انہیں شیعہ بتایا
جائے۔

علاوہ ازیں دیکھنا چاہئے کہ علوی اکابر مدینہ طیبہ میں رہتے تھے
امام صاحب کا قیام مکہ معظمہ میں تو ثابت ہے مگر مدینے میں مستقل طور
پر رہنا ثابت نہیں لہذا بعض لوگوں کا یہ قول کہ زید بن علی بن حسین سے
امام صاحب نے یا قاعدہ تحصیل علم کیا کسی طرح صحیح نہیں۔ اول تو اس لئے
کہ جب امام صاحب نے ان کے برادر بزرگ محمد الباقرؑ سے اکتساب علم
نہیں کیا تو ان سے کیا کرتے۔ پھر یہ ہے کہ جناب زید اگرچہ کچھ عرصہ کہنے
میں رہے۔ مگر یہ زمانہ ان کے سیاسی جوڑ توڑ کا تھا۔ اور خلافت قائم

کے خلاف وہ خفیہ ریشہ دوانیوں میں مشغول رہے۔ اس کا موقع ہی کہا
تھا کہ وہ علمی محفلیں منعقد کر سکیں اور لوگ طلب علم کے لئے ان کی پاس
آئیں۔ امام اعظمؒ اور ان کے اساتذہ کرام کے مسلک کے مطابق یہ مناسب
بھی نہ تھا کہ وہ جناب زید کے پاس جا کر اپنی بیعت مشکوک بنا لیں جو
حسب فرمان نبوی کسی طرح جائز نہیں۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے النافع الکبیر میں بطالع الجامع
الکبیر میں رجال حنفیہ کے تحت (ص ۱۴۱، طبع مصطفائی) شیخ الاسلام
ابن تیمیہؒ کے مذکورہ بالا بیان کی تردید کی ہے اور مشکوٰۃ المصابیح کے
مؤلف ولی الدین ابوعبد اللہؒ کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے جو انھوں نے
رجال مشکوٰۃ کے تراجم میں جعفر الصادقؒ کی بابت لکھا ہے

سمع منہ الائمة الاسلام
الاعلام نحو یحییٰ بن سعید
وابن جریر، ومالك بن
النس والثوری وابن
عینیة والوحیفة

ان سے یعنی صادق سے، اکابر ائمہ
نے حدیث کی سماعت کی ہے مثلاً
یحییٰ بن سعید، ابن جریر نے
مالک بن انس نے، سفیان ثوری
سفیان بن عیینہ نے اور ابو حنیفہ نے

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ولی الدینؒ دونوں آٹھویں صدی
کے بزرگ ہیں۔ اگر بات ان کے اپنے زمانے کی ہوتی تو ایک کا قول دوسرے
کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا تھا۔ گو پھر بھی قرائن سے وجہ ترجیح
معلوم کی جاتی یہاں معاملہ ہے دوسری صدی ہجری کا اور اس کے لئے دلیل
قریب العهد مصنف کے بیان سے لانی تھی۔ علاوہ ازیں شیخ الاسلام
محقق ہیں اور ولی الدین محض ناقل۔ ظاہر ہے کہ ناقل کے مقابلہ میں

محقق کا قول قابل ترجیح ہے جب تک اس کے خلاف دلیل سامنے نہ آجائے
ولی الدینؑ کے رجال کے تراجم میں تحقیق سے کام نہیں لیا۔ پانچویں چھیٹی
صدی ہجری میں جو باتیں مشہور ہو چکی تھیں وہی لکھدیں مثلاً حضرت
سعید بن جبیرؓ اور امیر حجاج بن یوسف کے مابین جو کچھ لکھا ہے وہ خالص
افسانوی ہے۔ ایسے ہی امام اعظمؒ کے متعلق وہی خرافات نقل کر دی ہیں
کہ امیر ابن ہبیرہؓ اور امیر المؤمنین المنصورؒ نے انھیں عہدہ قضا قبول
کرنے پر قید و بند اور تازیانوں کی ہزاروں اور تحسین میں ان کی وفات ہوئی
ایسے ہی متعدد رجال کے کوائف جو انھوں نے نقل کئے ہیں وہ اہل تحقیق
کے نزدیک قابل قبول نہیں۔

پھر دیکھنا چاہئے کہ شیخ الاسلام کی عبارت میں یہ کہاں ہے کہ
امام اعظمؒ اور جعفر الصادقؑ کی کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ان کے انھوں
نے کوئی حدیث ہی نہیں سنی اور ان کے مابین کبھی علمی مذاکرات ہی نہیں
ہوئے۔ وہ تو یہ فرماتے ہیں کہ ”یہ بات جانی پہچانی نہیں کہ ابو حنیفہؒ نے
جعفر الصادقؑ یا ان کے والد ماجد سے کوئی ایک مسئلہ بھی لیا ہو۔“ یعنی
انھوں نے اپنے فقہ کی تدوین میں فقہ جعفری سے کوئی مدد نہیں لی، اور نہ
اپنے دلائل میں انھوں نے ان دونوں بزرگواروں کے اقوال کو بطور حجت
پیش کیا۔ امام صاحب نے سیکڑوں بزرگواروں سے روایات نہیں ایسے
ہی جناب صادقؑ اور جناب باقرؑ بھی سنی ہوں گی۔ امام صاحب کو تو
اپنے چھوٹوں سے استفادے میں بھی عار نہ تھا۔ اور یہ دونوں تو بلند پایہ
تھے۔ یہاں سوال ان کی شخصیتوں کی بلندی اور ان سے استفادے
کی اہلیت کا نہیں۔ بلکہ تاریخی حیثیت سے ان سے استفادے کے

ثبوت کا ہے۔ جو نہیں ملتا۔ اور ملتا بھی کہاں سے کیونکہ جسے فقہ جعفری کہا جاتا ہے اس کا ذکر چوتھی صدی ہجری میں اس وقت سامنے آیا جب یونہی شیعہ حکومت نے پر پورے نکالے اور اس فقہ کی باقاعدہ تدوین صفوی دور میں ہوئی۔

امام اعظم عراقی تھے اور گاہے گاہے مختصر ساعات میں انکی ملاقات جعفر الصادق سے ہوئی ہوگی۔ لیکن امام مالک خاص مدینہ طیبہ میں رہتے تھے۔ اور شاید روزانہ ہی جناب صادق سے ملاقات ہوئی ہو، اب مؤطا شریف موجود ہے اس میں دیکھا جائے کہ جناب صادق سے کتنی روایتیں لی گئی ہیں۔ صرف معدودے چند۔ اس میں کثرت نظر آتی ہے۔ مالک عن ثناء عن ابن عمر کی اور یہ سلسلۃ الذہب کہ ملا تہ ہے جو درجہ حضرت مالک کے ہاں اس شد کا ہے وہی درجہ امام اعظم کے ہاں ابو حنیفہ عن عطاء عن ابن عباس کا ہے۔

علاوہ ازیں روایت لینا اور بات ہے اور اپنا مذہب نہیں کرتا بالکل دوسری بات۔ چنانچہ جن حضرات کے ذریعہ فقہ کی تعلیم عام ہوئی ان میں امام ابن تیمیہ کے علم مدینہ کے لئے حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام بتایا ہے۔ اہل مکہ کے لئے حضرت ابن عباسؓ کا اور اہل عراق کے لئے حضرت ابن مسعودؓ کا اس ذیل میں جناب جعفر الصادق کا نام نہیں ملتا۔ وہ بھی منجملہ ہزار ہا علماء کے تھے، مگر جہاں تک ان سے علم حاصل کرتے کا سوال ہے تو ائمہ فقہ کے اس سلسلے توجہ دوسرے حضرات کی طرف کی۔ جیسا کہ عرصہ کیا کیا فقہ روایت اور تفہیل فقہ و مختلف باتیں ہیں۔ فلاں نے فلاں سے روایت لی۔

تو اس سلسلے میں بیسیوں بلکہ سکرڈوں کا نام لیا جاتا ہے لیکن جب کہ جاتا ہے فلاں تفقہ علی فلاں تو وہاں صرف دو تین ہی نام جاتے ہیں۔ یعنی فلاں نے فلاں کی خدمت میں حاضرہ کر حدیث و فقہ پر عبور حاصل کیا ہے، استاد ایسے ہی بزرگواروں کو کہا جاتا ہے نہ کہ ہر شخص کو جس سے کسی نے کوئی روایت لی ہو جناب محمد الیافریزی نے تو امیر المؤمنین یزید کی والدہ ماجدہ سیدہ یسویٰ سے روایت لی ہے تو کیا انھیں ان کا شاگرد کہا جائے گا۔

امام ابو حنیفہ اور سیاسی ہنگامے

ائمہ فقہ و حدیث کے بارے میں ٹوٹا اور ابو حنیفہ کے متعلق خصوصاً عجیب و غریب روایتیں وضع کی گئی ہیں یا تو ان کی علمی حیثیت گرائے کی طرح سے یا یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ شیعہ تھے یا شیعیت کی طرف مائل کیوں بقول رواۃ وہ ان طالبیوں اور علویوں کے عقیدت مند تھے جنہوں نے وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلاف خروج اور بغاوتیں کیں۔ مقصد اہل تشیع کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا نزول قرآن کی غایت اور امت مسلمہ کی تشکیل سے غرض طرح طرح کی یہ بتائی گئی ہے کہ دنیا پر آل علی کے اقتدار کا پرچم اہل اہل بیت اور تابعین اسی خاندان سے ہاتھ میں امت کی زمام کار رہے۔ باقی مسلمانان تابعین کے مرکلف ہیں اور پس۔ لیکن ہوا یہ کہ نہ آل علی کو سیاسی اقتدار نصیب ہوا۔ اور نہ علمی حیثیت سے وہ ایسا مقام حاصل کر سکے کہ

کو چھوڑ کر لوگ تحصیل علم اور اکتساب نور کے لئے محض ان کی طرف مائل
ہوں اور اکھٹیں کے قبوض دنیا میں پھیلیں۔ یوں تو اس علوی خاندان سے
میں بھی بڑے بڑے حضرات گزرے ہیں جن سے امت فیض لیتی چلی آ رہی
ہے۔ مگر مقام اور مرتبے کے اعتبار سے ان کی حیثیت منجملہ دیگر اکابر امت
رہی۔ امت محمدیہ جیسی غیر طبقاتی امت میں پیدا ہونے والی برتری کا کیا تصور
ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہی کیا گیا جو شکست خوردہ لوگوں کا طریقہ
ہے کہ آل علی کے فضائل و مناقب کی موضوعات کے علاوہ ابوطالب
تک کے اسلام اور روحانی برتری کے ثبوت کے لئے روایتوں کا ایک
طوبار یا نذر ہدیا گیا۔ اور غلو میں نصاریٰ کو بھی بات کر دیا۔ نتیجے میں صحابہ
کرام، خلفاء اسلام اور علماء و فقہاء امت پر طعن و تشنیع کا یا تار گرم
ہو گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ایک لاکھ سے زیادہ تھے جن میں ہزار
سے زیادہ کیا صحابہ ہیں ان کی حیثیت ثانوی اور غیر اہم بنیادی گئی۔ بلکہ
ان کی تکفیر و تفسیق و ارتداد تک نوبت پہنچادی گئی۔ معارف قرآنیہ و
انوار نبوی کا گنجینہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو قرار دیا گیا اور اکابر صحابہ
کی موجودگی میں ان کے سامنے کے ان طالبی اور علوی بچوں کو ان سے
افضل و اقدس و انور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ جنہیں نہ تو نبی
صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف نصیب ہوا، نہ اعلاء کلمۃ اللہ کے
لئے جان کی بازی لگانے کا اور نہ نشر و اشاعت دین کے لئے حلقہ ہائے درس
قائم کرنے کا سہ

لہ فقہاء صحابہ میں عیادہ اربعہ ہیں یعنی خلفاء اربعہ کے بعد اپنے زمانہ میں رہائی و شہر

لیکن یہ کام چل نہیں سکتا تھا۔ جب کہ امت کے اکابر علماء و فقہاء کو بھی

بقیہ حاشیہ: شیخ الصحاہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن ابی اسحاق،
عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم اور مدینہ منورہ کے فقہاء
اربہ نذرانہ تابعین چار بزرگوار میں۔ حضرت سعید بن مسیب۔ حضرت عروہ بن الزبیر
حضرت عبدالملک بن مروان اور قبیصہ بن الزویج۔ ان کے بعد جن حضرات کو فقہ
سبعہ کہا جاتا ہے تو مراد ہوتے ہیں حضرت سعید بن مسیب، حضرت عروہ بن الزبیر
حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت فارحہ بن زید بن ثابت، حضرت عبید اللہ
بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، حضرت سلیمان بن لیساء اور ساتویں کے بارے
میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمر ہیں اور بعض کے
دیکھتے ہیں حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن بن اکحاش بن ہشام ہیں۔ یہاں حضرت
عبدالملک بن مروان کا نام نہیں لیا جاتا۔ کیونکہ ان کا شمار پھر خلفاء اسلام
اور امراء المومنین میں ہو گیا۔ اور حضرت قبیصہ کا نام اس لئے نہیں کہ وہ
شام تشریف لے گئے تھے۔ اور اموی خلافت کے عدلیہ کا انتظام سنبھال لیا تھا
جن حضرات کے نزدیک ساتویں فقیہ مدینہ حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن ہیں ان
میں سے ایک صاحب نے ساتویں کے نام اس طرح نظم کر دیے ہیں۔
الامن لا یقتدی بامثله
فقسنتہ ضیوی من الحق خا
یاد رکھو جو شخص ان اماموں کی اقتداء نہیں کرتا۔ اس کی قسمت کھوٹی ہے اور
وہ حق سے باہر ہو گیا۔

فخذ ہم عبید اللہ عروہ قاسم
سعید ابوبکر سلیمان خارج
تو انہیں گن لو وہ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ ہیں، عروہ بن الزبیر ہیں، قاسم
بن محمد بن ابی بکر ہیں سعید بن مسیب ہیں۔ ابوبکر بن عبدالرحمن ہیں سلیمان بن یزید فارحہ بن

کسی درجے میں اپنا ہم خیال ثابت نہ کر لیں۔ تاکہ عوام کو ان روایات و احادیث سے متاثر کر کے سلف کرام سے بدظن کرنے کی ہنرمندی کی بجائے اس غرض سے سب سے زیادہ توجہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی طرف کی گئی۔ کیونکہ وہ بھی الاصل تھے اور کوئی ہونے کے سبب یہ بیان قرین عقل باور کرایا جاسکتا تھا کہ ان کی ہمدردیاں آل علیؑ کے ساتھ تھیں۔ اور ان کے نزدیک خلافت قائمہ کے خلاف خروج کرنے میں وہ حق بجانب تھے۔

تشریح
اس طرح خلفاء اسلام اور ان کے امراء کو جو سیاسیات اسلامیہ کی تشکیل و ارتقاء کی ذمہ داریاں اٹھانے ہوئے تھے انھیں دنیا دار کھیرا کر ان کے اور ائمہ فقہ و حدیث کے مابین تناقض و تباہی کی خود ساختہ روایات کو فروغ دیا گیا حقائق بدیہیہ کو اس طرح دیا یا گیا کہ عام تعلیم یافتہ آدمی بہک جائے، نشر و اشاعت کی اس کثرت کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ آج عالم یہ ہے کہ اچھا اچھا

رفیقہ عائشہؓ، انہی حضرات سے تمام فقہاء ائمہ حدیث استناد کرتے ہیں صحاح ستہ کے سب مصنفوں نے انکی روایات لی ہیں ائمہ بن عروہ بن الزبیر حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کے سکے بھائی تھے اور تربیت دادہ تھے، حضرت قاسم بن محمد اور حضرت سالم بن عبد اللہ دو کول حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کے بھتیجے اور تربیت دادہ تھے، حضرت سلیمان بن ایسا ام المؤمنین سیدہ میمونہؓ کی مولیٰ اور تربیت دادہ تھے، حضرت خاریجہ اپنے والد ماجد سید زید بن ثابتؓ کے تربیت دادہ تھے ان حضرات نے بکثرت صحابہ کی صحبت اٹھائی تھی انہیں چھ سے امام ابن شہابؒ ہری نے فیض اٹھایا اور ان سے امام مالکؒ نے، حضرت سلیمان بن ایسا حضرت یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن ابی عبد الرحمنؒ نے اور ان سے امام مالکؒ نے

پڑھے لکھے لوگ ان خرافات کو واقعات سمجھ کر امت کے ائمہ و خلفاء کا تذکرہ کرتے ہیں جیسے وہ دشمنان ملت ہوں اور ان کی علمی و روحانی حیثیت بلند نہ ہو۔

امام صاحب کے زمانے میں آل علی میں سے تین اہم شخصیتوں نے خروج کئے۔ یعنی زید بن علی بن الحسین، محمد الارقط بن عبداللہ بن الحسن بن الحسن اور ان کے بھائی ابراہیم نے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت امام کی ہمدردیاں ان تینوں کے ساتھ تھیں۔ اور وہ اموی و عباسی خلفاء کو غاصب خلافت اور نااہل امت سمجھتے تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عقلاً و نقلاً صحیح صورت حال کیا ہے اور یہ کہ ایسا تصور کذب و افتراء تو نہیں۔ چنانچہ کتاب و سنت، مذہب امام، موقف تلامذہ امام اور حقائق تاریخیہ سے تو یہ سب کچھ افتراء محض ہی ثابت ہوتا ہے۔

امام ابو حنیفہ اور زید بن علی بن حسین | زید جناب علی زین العابدین کے فرزند تھے۔ اپنے والد

ماجد اور بہادر بزرگ محمد الباقرا کے بر خلاف ان میں غیر معمولی ترفع نفس تھا اور چاہتے تھے کہ ہم نسب اور ہم چشم لوگوں میں اپنا امتیاز قائم کریں، چنانچہ ان کی پہلی جھڑپ اپنے ابن عم عبداللہ المحض بن الحسن بن الحسن بن علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔

جبر اور زندک وغیرہ کا جو حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا خاص کر دیا گیا تھا۔ اور اسے وقف کی صورت دیدی گئی تھی اس کے پہلے متولی حضرت صدیق اکبرؓ ہوئے۔ پھر حضرت فاروق اعظمؓ، فاروقی عہد میں یہ تولیت حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے سپرد کر دی گئی۔ عہد عثمانی میں حضرت عباسؓ کی وفات کے بعد اس کے متولی تنہا حضرت علیؓ رہے، آل

عیاس نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، کیونکہ وہ ان سب کے بڑے بھائی تھے اور حق والوں کا حق ان کے ہاتھ میں محفوظ تھا۔

حضرت علی کے بعد ان کے متولی حضرت حسن ہوئے۔ ان کے بعد اس کی شتر کہ تولیت علی بن الحسین اور حسن المثنیٰ بن الحسن کے سپرد ہوئی۔ لیکن علی بن الحسین کے بعد اس کے تنہا متولی حسن المثنیٰ رہ گئے۔ اور ان کے بعد یہ تولیت ہاشمی خاندانی وقف کی۔ ان کے فرزند اجتہاد زید بن الحسن المثنیٰ کو ملی صحیح بخاری کتاب المغازی حدیث بنی النضر پھر ان زید کے بعد یہ تولیت ان کے بھائی عبداللہ المحض کو ملی۔ اس طرح وقف کا انصرام آل حسن کے ہاتھ میں چلا گیا کسی حسینی یا عیاسی کو اس پر اعتراض نہ ہوا۔ کیونکہ یہ تولیت تھی اور تاجاکنہ تصرف کا اس پر امکان نہ تھا۔ گویا پورے اموی دور میں اور ابتداء عیاسی عہد تک خلفاء اسلام نے اسی حسینی خاندان میں اس تولیت کا سلسلہ قائم رکھا۔ حضرت مروان اور ان کی اولاد اجداد میں جو خلفاء ہوئے، ان کے بارے میں یہ جھوٹی روایتیں مشہور کی گئیں کہ انھوں نے اس جائداد پر قبضہ کر لیا تھا اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے پھر حق ادا کر دیا تھا۔

زید بن علی بن حسین کو یہ صورت ناگوار تھی کہ حسینیوں میں تولیت رہے وہ تو اس تولیت میں شرکت چاہتے تھے۔ مگر عبداللہ المحض نے تمام بنو ہاشم کی حمایت کے سبب اسے منظور نہ کیا۔ دونوں میں جھگڑا بڑھا حتیٰ کہ راویوں کے بقول جناب زید چونکہ کنیز کے لہن سے تھے قرظین کے درمیان فتح قسم کی بدکلامی بھی ہوئی۔ پھر مقدمہ امیر مدینہ کے ہاں پیش ہوا۔ وہاں بھی دونوں نے ایک دوسرے کو سخت سست کہا، اور باہمی لپیٹ قسم کے طعنے دئے اس پر امیر مدینہ نے قریش اور انصار کا جرگہ طلب کر کے اس قضیے کا فیصلہ چاہا۔ لیکن وہ فیصلہ جناب زید

کے خلاف ہوا۔ اکھنوں نے اس کا مرقعہ امیر المؤمنین ہشام کے ہاں کیا مگر وہاں
 ناکامی ہوئی۔ ایسا ہی ایک مالی جھگڑا ان کا امیر عمر بن امیر المؤمنین ولید سے
 اور اس معاملہ میں بھی فیصلہ زید کے خلاف رہا۔ اسی قسم کے اور بھی معاملات
 یعنی زید، زمین کے جھگڑے تھے۔ ان سب میں امیر المؤمنین کے ہاں زید
 مطالبات کی تہذیب رائی نہیں ہوئی۔ طبری نے اپنے تشیع کے باوجود کئی صفحہ
 پر یہ سب روایتیں تفصیلاً بیان کی ہیں اکھنیں پڑھ کر کوئی یادگار آدمی نہ
 ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غرض یہ ہے کہ جناب زید کا کوئی معاملہ سیاسی، دینی یا نظریاتی نہ تھا
 مالی تھا۔ اور وہ بھی یا بھی لپست نزاع پر مبنی۔ طبری کی کسی روایت میں کوئی
 بات ایسی مذکور نہیں جس سے زید کے معاملات میں کوئی رفعت نظر نہ آئے لیکن
 ناکامی کے سبب وہ ایسے زحمت ہوئے کہ جذبات میں مہجیان پیدا ہو گیا۔ کوئے
 سبائیوں نے ان کی نفسیاتی کیفیت بھانپ لی اور اکھنیں اپنے ہاں بلا کر
 پرا بھارا۔ وہ خود بھی امیر المؤمنین سے اپنے غیظ و غضب میں یہ کہہ کر آئے
 تھے "اخرج ثمر لا ترائی الا حیث تکرہہ" میں جاتا رہا ہوں مگر مجھے
 ایسی حالت میں پائیں گے کہ آپ کو ناگوار ہوگی (اسی لئے دمشق سے مدینہ طیبہ
 واپس ہونے کے بجائے کوئے پہنچ گئے تھے، اور سیائیوں کے بھرے میں آکر
 خروج کر بیٹھے۔

مگر ان کی حسن تدبیر کا یہ عالم تھا کہ وقت پر دو سو آدمیوں کے زیا
 ان کے ساتھ نہ تھے۔ تب بن بر اکھنوں میں جس اموی امام کا پرچم لہرا رہا تھا
 درہم عصارت جسے ایک مثالی حکمران سمجھتی تھی، اس کے مقابلے میں دو سو
 آدمیوں کا بغاوت کرنا سوائے قسارتی الارض کے اور کیا تھا۔ اب غور

ہے کہ شیخ ابو زہرہ جیسے فرائض شخص نے ہوا پرست راویوں کی یہ روایت قبول کی کہ امام عظیم ابو حنیفہؒ نے اس خروج میں زید کی حمایت کی تھی اور اسے غزوہ بدر کے مماثل قرار دیا تھا۔ مگر عملاً ساتھ دینے کے بجائے کچھ رقم بطور ادا دیکر غریب بیٹھ رہے۔

جناب زید کا خروج سن ۱۲۰ھ کا ہے۔ یعنی اس وقت امام ابو حنیفہؒ بہتر مطلق ہونے کے درجے پر نہ تھے، بلکہ ہزار ہا علماء میں سے وہ بھی ایک عالم تھی جن کا نہ فتویٰ کوئی امتیازی درجہ رکھتا تھا اور نہ عمل، ان کے استاد امام حمادؒ بالوزندہ تھے یا انھیں وفات پائے اور امام صاحب کو ان کی سند سمجھائے چند ہی دن ہوئے تھے، کیونکہ امام حمادؒ کی وفات بھی سن ۱۲۰ھ ہی کی ہے۔ امام صاحب کی اس وقت یہ حیثیت نہ تھی کہ اپنے شیخ کے موقف کے خلاف کوئی اقدام کرے کیونکہ اس طرح وہ حضرت حمادؒ کے تلامذہ میں اپنا وقار کھو بیٹھتے، اختلاف کرنے کا ذریعہ تو انھیں بہت بعد میں ملا۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر قبرض محال امام صاحب نے اپنے ساتھ کرام کے مواقف سے ہٹنے کی جرأت کی اور عظیم قلب سے یہ جاننا نہ رہتی پرہیز، ان کے خروج میں مصلحت ملیہ ہے اور ان کا ساتھ دینا ایسا ہی ہے جیسے غزوہ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر کفار سے نبرد آزما ہونا، یعنی انھوں نے امت کے متفق علیہ امام ہشام امیر المؤمنین کو ابو جہل کی طرح سمجھا۔ ان کے اعوان و انصار اور علماء و فقہاء امت کے علاوہ جمہورینی امیہ و بنو ہاشم کو کفار مکہ کی طرح جانا، پھر ان کے مقابلہ میں جناب زید کی شان سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سی قرار دی اور ان کے نزدیک دوسو کوئی جو جناب زید کے ساتھ میدان میں آئے وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ان

۳۱۳ جان باز ساتھیوں کا درجہ رکھتے تھے۔ جھٹوں نے بدر کے میدان میں کفر کا جھنڈا سرنگوں کیا تھا۔ تو امام صاحب کو سویریں بعد یا سانی شہداء بدر کا درجہ حاصل کرنے میں کیا چیز مانع تھی۔

اگر ایک شخص کو اطمینان ہو کہ جان دیکر اللہ کے ہاں اس کا شمار بدر غازیوں اور شہیدوں میں ہو گا تو اسے تو اس معرکہ میں جناب زید کے پہلو بہ پہلو لڑنا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کچھ مال دے کر گھر بیٹھ رہے۔ خدا و رسول کی نافرمانی پر جو بیعت امیر المؤمنین سے کی تھی اسے بھی توڑا، اور حاصل یہ ہوا کہ نہ غازیوں میں رہے اور نہ شہیدوں میں!۔ امام صاحب جیسے علم و اتقی کے متعلق اور دوسرے لوگوں کی بیان کردہ یہ روایت ہیچ شخص ہے اور کسی درجے میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ امام صاحب نے چونکہ زید کا ساتھ نہیں دیا اور نہ امیر کو فائدہ اٹھایا اس میں بلوث سمجھا۔ اس لئے یہ ناپاک روایت وضع کی گئی ہے کہ امام صاحب نے کچھ روپیہ دے کر انکی خفیہ مدد کی تھی۔

ان راویوں کو جب اس خفیہ مدد کا علم ہے تو اموی گورنر امیر یوسف ابن عمر جیسے مدبر کو اس کا علم کیوں نہ ہو سکا، اکھنوں نے امام صاحب کو ان جرائم کی سزا کیوں نہیں دی جب کہ اس وقت ان کی کوئی خاص نمایاں حیثیت بھی نہ تھی جو امیر کو ان کے قتل پر کسی فتنے کا قدشہ ہوتا۔ کیونکہ زید سے اہم اس وقت ان کی شخصیت نہ تھی۔ انھیں جب قتل کر دیا تو امام صاحب کو کچھ کر سکتے تھے۔

جس شخص کو تمام اہل حق کے فقہاء کا امام بتا تھا، اگر اس کا کردار ایسا معمولی صاحب عزیمت کا سا بھی نہ تھا، کہ جس بات کو حق جانے کے لئے جان دے، تو اس کی حیثیت یہ کب رہتی ہے کہ اس کے متعلق امام شافعی

فرأین الناس عیال لای حنیفة فی الفقة رلوگ فقہ میں ابو حنیفہ کے پروردہ ہیں۔ جناب زید کے خروج میں حضرت امام کی پھر دی ان کے ساتھ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ امام صاحب کا اور ان کے اساتذہ کرام کا کھلا مذہب ہے۔ لاندی الخروج علی ائمتنا وولایة امورنا رہم اپنے خلفاء اور اپنے امراء کے خلاف خروج کو ناجائز سمجھتے ہیں (سلطان ابو المظفر عیسیٰ بن ایوب الملک المعظم نے اسہم المصیب فی الرد علی الخطیبت میں حضرت امام کا یہ قول نقل کر کے آپ کا مفصل فتویٰ اس طرح بیان کیا ہے (ص ۴۴، ۴۵، طبع دیوبند)۔

اذا سمع الامام ان قومًا یدعون الی الخروج فعلیہ ان ینذرنہم ویسکہم حتی یظہروا توبۃ۔ فاذا صارلہم فبئۃ یرجعون الیہا، یقتل مقاتلہم ویجہز جرحہم ویقتل سائرہم کما یقتل الکفار انھیں قتل کرے ان کے زخمیوں کو مار ڈالے اور ان میں سے جو گرفتار ہو جائیں انھیں ایسے ہی قتل کرے جیسے کافروں کو مارا جاتا ہے۔

پھر سلطان موصوت فرماتے ہیں۔ فمن یکون ہذا رایہ کیف یری الخروج علی الائمة قال للہ تعالیٰ واما تخافن من قوم تو جس شخص کی رائے یہ ہو وہ خلفاء کے خلاف خروج کو کس طرح جائز سمجھ سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

خِيَانَةً فَأَبْنَدُوا إِلَيْهِمْ عَلَى سِوَاءِ
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ

وَقَالَ لَا يُفْضَى قِضَاءُ قَاضِي
أَهْلِ الْبَغْيِ وَلَا تُعْقَلُ شَهَادَاتُهُمْ

اگر تمہیں کسی گروہ کی طرف سے خیانت
کا خطرہ ہو تو ان کا عہد ویسے ہی انہر
پھینک مارو۔ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے
والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر حضرت

امام فرماتے ہیں کہ یا غیوں کے قاضی کا فیصلہ ناقابلِ تنقید ہے اور ان کے گواہوں
کی گواہی ناقابلِ قبول۔

یعنی یا غیوں کے تسلط کے زمانہ میں جو عدالتی فیصلے ہوئے ہوں، وہ
کالعدم قرار دے جائیں گے اور ان کی سماعت دوبارہ ہوگی۔

سلطان ابوالمنظرف الملک المعظم، سلطان غازی صلاح الدین ایوبی
کے بھائی تھے، ان کا گھرانہ شافعی تھا مگر یہ خود حنفی تھے اور اپنی عقیدت و محبت
میں اتنے شدید کہ سوائے امام اعظمؒ کے اور کسی کا قول نہیں لیتے تھے۔ یعنی نہ
صاحبین کا اور نہ ان کے تلامذہ میں سے کسی اور کا خطیب بغدادیؒ نے تاریخ
بغداد میں امام اعظمؒ کے متعلق بہت واپی روایتیں لکھی ہیں۔ الملک المعظم
نے السہم المصیب میں ان پر سخت تنقید کی ہے۔ یہ رسالہ مصر و ہندوستان سے
شائع ہو چکا ہے۔ ہمارے سامنے دیوبند کا مطبوعہ رسالہ ہے، سلطان
موصوف نے جب یہ رسالہ لکھا تو اس وقت آپ نصاریٰ سے برسرِ پیکار تھے
اور ناپلس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ استحضارِ علمی اور طمانیتِ قلب کی یہ نشان کھی
کہ اسی عالم میں یہ رسالہ لکھا۔ حالانکہ کتابیں ساتھ نہ تھیں جیسا کہ خود
اس رسالے میں بیان کیا ہے، ایسے جامع الصفات ہوا کرتے تھے، ہمارے
حکم راں۔ جی بھی تو اس دنیا کو نور و حکمت سے بھر دیا اور تہذیب و تمدن کے
اس دریچے تک امت کو پہونچا دیا کہ اہل عالم کے لئے نمونہ بنی۔

خلفاء اسلام کے خلاف خروج کے بارے میں سلطان موصوت نے
امام صاحب کا فتویٰ نقل کیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خلیفہ و امام جاعت
کے خلاف کھڑے ہونے والے کسی شخص سے امام ابو حنیفہؒ کو ہمدردی ہونے کا
کوئی امکان نہ تھا۔ یہ فتویٰ کتاب و سنت کے صریح نصوص پر مبنی ہے۔
چنانچہ صحیح مسلم میں ہے۔

من خلع یداً من طاعة لقی
اللہ یوم القیمة لاجحة له و
من مات ولیس فی عنقه
بیعة مات میتة جاهلیة

جس نے خلیفہ وقت کی بیعت سے ہاتھ کھینچا
وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ایسے جائیگا کہ اس
کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی اور جو شخص
ایسی حالت میں مرا کہ (خلیفہ اسلام کی)
بیعت اس کی گردن میں نہ ہو۔ تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

فقہ کے چاروں ائمہ اس بارے میں متفق ہیں، اور احکام خداوندی کے مطابق
ان کا فتویٰ ایک ہی ہے: "حیات احمد بن حنبل" سے حضرت امام احمدؒ کا وہ فتویٰ
یہاں نقل کیا جاتا ہے جس کی روایت امام جوزیؒ نے کی ہے۔ جو افسر روایت میں
انتہا درجے کے سخت تھے۔ وہ فتویٰ یہ ہے۔

۱۔ امام وقت اور خلیفہ قائم کی اطاعت واجب ہے، خواہ وہ
فاسق و فاجر ہو یا نیکو کار اور پرہیزگار۔ وہ جب مسند خلافت
پر اس طرح متمکن ہو کہ لوگ اس کی امامت پر جمع ہو گئے ہوں
اور اس سے راضی ہوں، یا وہ برادر شمشیر خلیفہ بنا ہوا اور سب
لوگ اسے امیر المؤمنین کہنے لگے ہوں تو کسی شخص کے لئے جائز
نہیں کہ وہ ان ائمہ و خلفاء پر طعن کرے۔ جس شخص نے
ایسے امام المسلمین کے خلاف خروج کیا جس پر لوگ اجماع

کر چکے ہوں اور اس کی خلافت مانتے ہوں، خواہ یہ اقرار
برضا و رغبت ہو یا بکراہ تو اس خروج کرنے والے نے
مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے آثار کے خلاف کیا۔ اور اگر وہ اس خروج کی حالت
میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

چنانچہ یہی ارشاد نبوی ہے صحیح مسلم، ج ۲ ص ۱۳۶، طبع مصر
عن زیاد بن علاقہ قال سمعت عمر بن الخطاب
قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم
يقول ستكون هناة وهناة
من اراد ان يفرق امر هذه
الامة وهي جميع فاقتلوه
كائنا من كانت۔

حضرت زیاد بن علاقہ سے مروی ہے
وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمر بن الخطاب
کو فرماتے سنا، وہ فرماتے ہیں میں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے
سنا کہ عنقریب فتنے پر فتنہ پیا ہوگا تو
جو شخص امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہے

اس حالت میں کہ امت متفق ہو چکی ہو تو ایسے شخص کو قتل کر دو اگرچہ وہ کوئی ہونے
یہ ہے اللہ کی کتاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، صحابہ کرام رضی
اللہ عنہم کا اجماع اور ائمہ اربعہ کا متفق علیہ فتویٰ۔ تو ایسی صورت میں اس کا
قطعاً امکان نہ تھا کہ امام اعظم کو جناب زید یا بعد میں خروج کرنے والے شخص سے
شتم برابر بھی ہمدردی ہو، یا وہ اس خروج و بغاوت کو کسی درجے میں جائز سمجھتے
ہوں چہ بے نیکیہ اسے جہاد کہیں اور غزوہ بدر کے مماثل تینا کر معاذ اللہ زندہ و
اسعاد میں مبتلا ہوں۔

جناب زید کا شمار علماء نبوی ہاشم میں ہے۔ واصل بن عطاءؓ کے شاگرد تھے
اس لئے رجحان اعتزال کی طرف تھا۔ ان کے متبع انھیں امام کہتے ہیں اور ان کی

اس فقہ پر اپنے علم و عمل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں امام کا مفہوم وہ نہیں جو اثنا عشریہ کے ہاں ہے۔ نہ وہ اکھنیں خدا کی طرف سے مقرر شدہ کہتے ہیں اور نہ معصوم جانتے ہیں۔ ان کے ہاں امامت کا مفہوم دینی اور سیاسی سربراہی سے ہے۔ ان کے گروہ کی حیثیت پھر بھی جماعت کے مقابلے میں ایک فرقے کی سی ہو گئی اگرچہ وہ اپنے عقائد و اعمال میں جماعت سے بہت قریب ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ضعیف اور بعض بے پایہ عارضین جو اکھنیں اپنے ان زیدی ائمہ سے ملیں انہی پر ان کا مدار ہے اگر جناب زیدی نے دوست دشمن کی تمیز کی ہوتی، غدار کو فی سبائیوں کے بہکائے میں نہ آتے اپنے والد باجد اور برادر بزرگ کے طریقے پر چلتے اور عدالتی فیصلے خوشدلی سے قبول کر لیتے تو یہ زیدی فرقہ نہ بنتا۔ زیادہ سے زیادہ حنفی شافعی مذہبوں کی طرح ان کا بھی ایک فقہی مکتبہ فکر بن جاتا اور ان کا شمار علماء سنت میں ہوتا۔ یعنی ان کے خروج کے سبب ان کے فرقے میں جو بدعتاۃ خیالات آگئے اور جماعت کے مسلک سے وہ یک گونہ باہر ہو گئے، یہ بات نہ ہوتی علم تاریخ اور علم سیاست کا غیر جانبدار طالب علم ان کے اقدام کو کسی طرح تعمیری نہیں کہہ سکتا۔ علامہ شبلی نے بھی بے الفاظ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ امت کے متفق علیہ خلیفہ اور عظیم الشان امام ہشام ابی المونین کے متعلق ان کا مخصوص گستاخانہ لہجہ اپنی جگہ ہے (سیرۃ النعمان ص ۴۴) طبع دیوبند) فرماتے ہیں۔

”جس قدر تاریخیں اور خیال کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں انہیں کہیں اس کا ذکر نہیں، حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابل ذکر واقعہ تھا یعنی امام ابوحنیفہؒ کا جناب زیدی کی مدد کرتا۔ (ع)

لیکن اس کی سلطنت نہایت امن و امان کی سلطنت تھی ملک
میں ہر طرف امن و امان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ رعایا عموماً
رضامند تھی۔ بیت المال میں ناجائز آمدنیاں نہیں داخل ہو سکتی
تھیں۔ اس حالت میں امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت کی کوئی
وجہ نہ تھی۔

لوگوں نے جو یہ ہوا باندھی ہے کہ اہل کوفہ میں سے اکھارہ ہزار آدمیوں
نے جناب زید سے بیعت کر لی تھی۔ اور ایک لاکھ آدمی ساتھ دینے کو تیار
تھے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور نہ اس کا امکان تھا۔ اول تو اس لئے کہ
امیر یوسف بن عمر جیسے جہاں دیدہ اور بیدار مغز والی کی نگاہ سے اختلاف
کی یہ صورت پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اور دوسرے صراحتاً جو بات مانجھ
آئی وہ یہ تھی کہ دوسو سے زیادہ آدمی جناب زید کے ساتھ نہ تھے۔ فوج سے
ان کا کوئی باقاعدہ مقابلہ نہیں ہوا۔ معمولی شورش تھی جو اچانک نمودار ہوئی
اور زید کے کام آجانے پر ختم ہو گئی۔

انتہیالا۔ امام اعظمؒ نے یاغیوں کے متعلق جو فتویٰ دیا ہے، وہ
بظاہر بہت سخت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ کافروں اور معمولی یاغیوں کے ساتھ
مسلمانوں کا یہ طرز عمل کبھی نہیں رہا کہ زخمیوں اور اسیروں کو قتل کر دیا جائے
تاریخ اس پر شاہد ہے اور اس کی مثالیں دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ
امر یدہی ہے، ہمارے خلفاء اور ان کے تحت وہ سلاطین جو اسلام کے نمائندے
تھے، اکھنوں نے نہ کبھی کسی لہتی میں قتل عام کرایا، نہ اسیران جنگ کو لازماً قتل
کیا اور نہ زخمیوں کو مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اکھنوں نے کسی لہتی کو یا کھیتوں کو
یا یاغیوں کو کبھی نہیں اجاڑا۔ اور نہ مواشی کو ضائع کیا۔

لیکن امام اعظمؒ رہتے تھے کونے میں اور انھیں سیاسی عزائم معلوم تھے یعنی یہ کہ ان کا مقصد محض سیاسی اختلال پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ نفس دین کو غارت کرنا چاہتے ہیں اس لئے آپؒ نے یہ سخت فتویٰ دیا۔ اور یہ فرق ہمیں حضرت علیؓ کے عمل سے بخوبی معلوم ہو جاتا۔ اصحاب جبل و صغین سے آپؒ نے قتال کیا جس کی نوبت سیاستوں کی تخریبی کارروائیوں کے سبب آئی۔ لیکن جبل میں فتح پانے کے بعد آپؒ نے اعلان کر دیا کہ نہ کسی قرار ہونے والے کا پیچھا کیا جائے اور نہ کسی زخمی کو مارا جائے (امام شافعیؒ الام، ج ۲، ص ۱۶ طبع مصر) ان کا مال بھی نہیں لوٹا گیا۔ مورخوں کے بیان کے مطابق ان کا جو مال سیاستوں سے لوٹ لیا تھا وہ سب ان سے لے کر بھرے کی جامع مسجد میں جمع کر دیا کہ جس کا ہولے جائے۔ اسی طرح صغین میں ایک اسیر آپؒ کے پاس لایا گیا تو آپؒ نے اسے رہا کر دیا۔ اور فرمایا "میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ میں نہیں قتل نہیں کروں گا" (ہمیں کتاب ص ۲۲۲)

امام اعظمؒ کے سامنے خروج کرنے والے سیاسی تھے۔ جن کے عزائم کی زد میں نفس دین تھا، اس لئے آپؒ کا فتویٰ اتنا سخت ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ خود امیر المؤمنین ہشامؒ نے یہ شورش رفع کرنے کے لئے امیر کوفہ کو جوڑنا بھیجا تھا وہ بہت نرم تھا۔ یعنی حسب بیان طبری آپؒ کے احکام خلاصہ یہ ہیں "میں نے دیکھا کہ زید ایک جھگڑالو، چرب زبان اور تقریر میں رنگ آمیزی کرتے والے شخص ہیں۔ انھیں کونے میں پھرنے نہ دیا جائے۔ کیونکہ لوگوں کو گمراہ کر دیں گے، انھیں نکال دو کہ سب کی سلامتی رہے اور کسی کا خون نہ بہے۔ میں تفرقہ کے مقابلے میں امن پسند کرتا ہوں۔ جماعت اللہ کی مضبوطی"

رسی ہوتی ہے۔

اور اگر تم سے ان کا تصادم ہی ہو جائے تو تم کو اللہ کی مدد سوت
ملے گی جب تم اول اپنی حجت پوری کر دو گے۔ جنگ کے بعد
ان لوگوں کے اہل و عیال سے کچھ تعرض نہ کرنا۔ اور فوج کو
حکم دینا کہ ان کے گھروں میں داخل نہ ہوسے پائے، امیر
المومنین کا طرز عمل اپنی قوم کو مہالک سے بچاتے، راہ راست
پر لانے اور سیدھے راستے پر چلانے میں شفیق والد کی طرح
ہے۔ جو اپنی اولاد کو ہر خطرے سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔

اس فرمان کا نتیجہ تھا کہ معمولی چھڑپ کے علاوہ کچھ نہ ہوا۔ جناب
زید کا سر کٹواتا۔ جثہ سولی پر لٹکاتا۔ اس پر تازیانے برساتا، اور پھر ایک
گڑھے میں پھینک دینا وہ خرافات ہیں جو ذہنوں کو باؤٹ کرنے کے لئے
سبائی راویوں نے وضع کر کے ”زید شہید“ کا لقب دیا ہے۔ جناب زید
سے امیر المومنین ہشام کے گونا گوں نسبی اور نسبتی رشتے تھے۔ ایسی صورت
میں ان راویوں کی مکروہ باتیں ہرگز قابل اعتناء نہیں۔ اگر ایسے قریب ترین
رشتے نہ ہوتے تب بھی ان بہیمانہ حرکتوں کا امکان نہ تھا، جو تمام بیوہانہم
کو امیر المومنین سے برگشتہ کر دیں۔ اور عام مسلمان بھی برا فروخت ہو جائیں
زید کے اس سانچے پر عالم اسلام میں کوئی پہچان نہ ہونا اس کی بین دلیل ہے
کہ ہم عصرا مت کے نزدیک کوئی کام شریعت اور اخلاق فاضلہ کے خلاف
نہیں ہوا۔ اور اس کی بھی دلیل ہے کہ جناب زید کے خروج کو جائز نہیں
سمجھا گیا۔ یہ جانی کہ حضرت امام اعظمؒ کی ہمدردی ان کے ناجائز فعل سے
امام ابوحنیفہؒ اور امیر ابن ہبیرہؒ۔ امیر زید بن عمر جو ابن ہبیرہ کے نام

سے مشہور ہیں، اموی عہد کے آخری والی کوفہ تھے، جنہیں امیر العراقین کہا گیا
 انہی کے زمانے میں انقلاب آیا اور خلافت عباسیہ قائم ہوئی۔ ولی عہد خلافت
 حضرت ابو جعفر المنصور عباسیؒ نے انہیں امان دی تھی۔ لیکن ابو مسلم خراسانی جو
 عربوں کا سخت دشمن تھا۔ اس نے اپنے تمام رازداریوں کے سبب یہ امان منسوخ
 کر دی اور امیر ابن ہبیرہ پر یہ الزام رکھ کر کہ وہ عباسیوں کے بجائے علویوں کی
 خلافت کے خواہاں ہیں۔ انہیں شہید کر دیا۔ امیر المؤمنین المنصورؒ جب
 خود سربازانے خلافت ہوئے تو جن دجورہ کی بنا پر ابو مسلم کو قتل کیا گیا ان
 میں علاوہ دوسری سخت تر یا توں کے امیر ابن ہبیرہ کا خون ناحق بھی تھا۔
 بہر حال چونکہ عراق میں عباسیوں کے داعیوں کا زور پڑ رہا تھا۔
 اور حالات سے انتشار و اخلال کے خطرات اموی حکومت میں پیدا ہو رہے
 تھے، اس لئے امام ابو حنیفہؒ حجاز چلے گئے۔ اور فتنہ فرو ہوئے تک وہیں
 رہے۔ آپ کے سے کوفے اس وقت آئے جب خلافت عباسیہ قائم
 ہو گئی۔ حضرت امام کا اس طرح کوفہ چھوڑ دینا، لوگوں کے لئے یہاں نہ بن گیا
 اور ایسی ایسی روایتیں وضع کیں جن کا یطلان عیاں ہے۔ تخریبات منافیہ
 نویوں پر ہوتا ہے جنہوں نے عرصہ دراز کے بعد یہ مفتریات اپنی کتابوں
 میں بھر دیں اور اس بین تضاد کا بھی خیال نہیں کیا جو ایسی ہر روایت میں
 عیاں موجود ہے۔ اور نہ یہ دیکھا کہ جس امام کی وہ بات کر رہے ہیں اس کے
 اپنے مواقف کیا ہیں۔ اور اس لئے کن امور کی تعلیم دی ہے۔

کبھی آپ کی علمی قابلیت دکھانے کے لئے کہتے ہیں کہ خوارج ریختی
 اس وقت کے سیاسی ہنگامہ آرائی کرنے والوں کی اصلاح کے لئے امیر ابن
 ہبیرہؒ نے امام ابن ابی لیلہؒ اور قاضی ابن شہیرہؒ سے ایک رسالہ لکھوایا

لیکن عرصہ دراز کے بعد وہ جو کچھ لکھ کر لائے اسے امیر نے پسند نہیں کیا کسی شخص
 نے کہا یہاں کوئی میں ایک صاحب ہیں ابو حنیفہ نعمان بن ثابت، وہ ایسا رسالہ
 لکھ سکیں گے۔ امیر نے آپ کو طلب کر کے ان دونوں صاحبوں کا نوشتہ
 دکھایا، تو امام نے فرمایا اس میں اللہ اور رسول کے علاوہ سب غلط ہے۔ پھر
 قلم برداشتہ ایسا مقالہ لکھ دیا جو امیر کو پسند آ گیا۔ گویا جو شخص خاص کوئی میں
 امام حماد کی مستند پر بیٹھا ہے اور اس کا وہاں عظیم الشان حلقہ درس ہے اسے
 امیر جانتے نہ تھے اور اس کے تعارف کی ضرورت تھی۔ راوی کا مقصد محض قاضی
 ابن ابی بسلّی اور قاضی ابن شبرمہ کی تنقیص ہے کہ وہ ایک معمولی رسالہ
 بھی نہ لکھ سکے۔ پھر راوی بھی کہتا ہے کہ امام صاحب شورش پسندوں
 نالاں تھے اور حکومت قائمہ سے وفاداری ایسی ضروری جانتے تھے کہ فوراً اسکی
 تائید میں ایک مسکت رسالہ لکھ دیا۔

اب دوسری روایت کے مطابق اموی حکومت کے امیر نے سبیا سی
 اختلال کے سبب چاہا کہ ایک "حب اہل بیت" عالم کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی حکومت
 مضبوط کریں۔ چنانچہ امام صاحب کو قاضی بنانا چاہا، اور بعض کے نزدیک
 ایساں گئے کام ان کے سپرد کرنا چاہا تو امام صاحب نے "مخالف حکومت
 ہونے کے سبب انکار کر دیا۔ اس پر امیر نے انھیں قید کر کے روزانہ کورن
 لگواے، تاکہ علماء و فقہاء سے آکر فریاد کی کہ اگر اس شخص کو رہا نہ کیا گیا
 تو یہ مر جائیگا۔ امیر نے کہا کہ کوئی آدمی اسے سمجھائے کہ مجھ سے کچھ مہلت
 لے تاکہ میں اسی چھوڑ دوں، اماں نے مہلت مانگی جو دیدی گئی تو چپکے سے سکے فرار ہو سکے۔ یہی
 یا تو حالت اتنی سقیم تھی کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے یا چنانک اتنی طاقت
 آگئی کہ اونٹ پر بیٹھ کر سیکڑوں میل کا سفر کر ڈالا۔ پھر ایک طرف

حکومت کے ایسے وفادار تھے کہ جھٹ اس کی حمایت میں رسالہ لکھ دیا، یا ایسے مخالف ہو گئے کہ حکومت کا عہدہ قبول کرنے کی بجائے قید و بند اور کڑوں کی سزا کو ترجیح دی۔

ایک طرف آپ کا یہ مقام بتایا جاتا ہے کہ اموی حکومت کا ساتھ دیتے تو کوئی امن ہو جاتا۔ اور آپ کے ذریعہ اختلال سے نجات ملتی یعنی شہر میں آپ کی ایسی اہمیت تھی کہ امیر آپ کی اعانت کے محتاج تھے، اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ آپ اتنے بے حیثیت تھے کہ قید میں رہے کوڑے کھائے اور اہل شہر نے اس کی پرواہ بھی نہ کی اور سب ایسے ہو گئے جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ یعنی امام کی شہرت اور مقبولیت بھی ہے اور لوگوں کی ان سے بے تعلقی بھی۔ وہ ایک طرف محب اہل بیت ہیں کہ عباسی داعیوں کو رام کر سکیں اور حکومت کے ایسے طرفدار بھی کہ عباسی داعیوں سے برگشتہ کرنے کے لئے رسالہ بھی لکھ دیں۔

یہ سب متضاد اور پاور ہوا، باتیں محض یہ بہتان رکھنے کے لئے وضع کی گئیں کہ امام صاحب کو خلافت قائمہ کا مخالف ثابت کریں یعنی مولوں کا جن کی حکومت قائم تھی اور عباسیوں کا بھی جن کی حکومت قائم ہونے والی تھی حالانکہ سیدھی سچی بات یہ ہے کہ آپ چونکہ خالص علمی آدمی تھے اور غیر سیاسی زندگی کے خوگر۔ اس لئے عراق کی مکرر فتادیکہ کر مکہ معظمہ چلے گئے حالانکہ

اے حجاز کے متعلق حضرت محمد الامام عباسی کا حکم تھا کہ عباسی داعی وہاں کچھ کام نہ کریں اور حریفین میں اختلال کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے پائی اور کمال امن با حریفین پر قبضہ سبک آخر میں کیا گیا اور قبضہ غیر کسی خونریزی کے ہو گیا کیونکہ عباسی امامت پر امت متحد ہو چکی تھی

نہ امیر اور ان کے درمیان کوئی مخالفت تھی اور نہ عباسی داعیوں سے کوئی ربط یا اختلاص تھا۔ رسالہ لکھواتے، قاضی بنانے کی پیش کش کرنے اور نہ ملنے پر قید و بند کی مصیبت میں مبتلا کرتے کی سب داستانیں بے حقیقت ہیں، ان روایتوں تضاد ہی ان کے کذب و زور ہونے کی بین دلیل ہے۔

پھر کہا جاتا ہے کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ نے امام صاحب کو سمجھایا تھا کہ جس طرح ہم نے امیر کے مجبور کرنے پر حکومت کے منہ قبول کر لئے ہیں۔ اسی طرح آپ بھی ظلم و تشدد سے بچنے کے لئے امیر کی بات مان لیجئے اس پر امام نے فرمایا: یہ شخص اگر مجھ سے واسطہ کی مسجد کے ستون گننے کو کہے گا۔ تب بھی میں اس کی بات نہیں مانوں گا۔ یعنی میں تو کوفے میں اور ذکر کر رہا ہوں واسطہ کی مسجد کا جیسے کوفے کی کسی مسجد میں ستون ہی نہ تھے۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ امیر ہبیرہ کی ولایت سے بھی پہلے سے محکمہ قضا سے وابستہ چلے آتے تھے کچھ جبر تھا اور نہ تنبیہ۔ بلکہ قواعد دینیہ کے تحت خلافت قائمہ سے وابستہ ضروری سمجھنے کی وجہ سے یہ حضرات مناصب پر فائز ہوئے اور عملی روحانی و انفرادی سبب علی سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش ہو تاکہ اگر کوئی سیاسی فتنہ اٹھے عوام کی حقوق محفوظ رہیں اور نا اہل لوگوں کا تصرف عدلیہ نہ ہو سکے اور سیاسی اختلال قانون کی حکمرانی پر کچھ برا اثر نہ پڑے پائے، چونکہ اسلامی حکومت میں علی ایک خود مختار ہوتا ہے اس لئے حکومت کے رد و بدل سے عدلیہ پر کبھی آنچ نہ آئی۔

طبری نے ۱۲۰ھ کے احوال کی تحت ملاحظہ کی ہے "و علی قضاء الکوفۃ اثر رکوفے کے قاضی ابن شبرمہ تھے" پھر ۱۲۱ھ کی تحت کہتے ہیں "و علی قضاء الکوفۃ ابن شبرمہ رکوفے کے قاضی ابن شبرمہ تھے" اسکے بعد ۱۲۲ھ کے احوال میں بتاتے ہیں "و قاضی الکوفۃ"

ذہ السنۃ محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ راس سال کوٹنے کے
 حتی محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ تھے۔ یہاں سے یہ بھی عیاں ہوا کہ جناب
 کے خروج کے وقت یہ دونوں جرگوار کوٹنے میں موجود تھے اور اکھڑوں نے
 ہنگامے سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔

امام ابن قتیبہؒ نے صراحت کی ہے (المعارف ص ۲۱۶)

کان محمد بن عبد الرحمن
 ابی لیلیٰ ولی القضاء لیتی
 مینہ ثم ولیہ لیتی العباس
 کان فقیہاً مقتباً بالرای
 جہاد سے فتویٰ دیتے تھے یعنی امام عظیم ابو حنیفہ اور ان کا مذہب ایک تھا۔

ہمارے علماء و فقہار کا یہ دستور تھا جیسا کہ بیان ہوا کہ وہ غیر سیاسی
 زندگی بسر کرتے تھے اور جانتے تھے کہ قواعد شرعیہ کے مطابق امام جماعت سے
 وابستگی اور اس کے ساتھ تعاون لازم ہے۔ جن حضرات نے کسی عذر کے سبب
 اپنی کمزوری دیکھ کر حکومت قائمہ کا عہدہ قبول نہیں کیا یا اپنی علمی شان و خلافت
 یا نایادنیوی مصالح سے بے نیاز رہے اور زاہدانہ زندگی بسر کی وہ بھی سب کے
 سب بالا امتثال امام جماعت کی بیعت پر استقامت کو فریضہ ملیہ سمجھتے تھے، ان کا
 ہمارے حکومت کی تحقیر یا اس پر تعلقی کو سبب نہ تھا اور نہ اس لئے تھا کہ انکی نگاہوں پر
 ملاقت قائمہ کی حیثیت آئینی نہ تھی۔

اس زمانہ میں ہر بالغ شخص امام وقت سے بیعت کرتا تھا۔ چھوٹی سے
 چھوٹی بستی میں بھی یہ بیعت لی جاتی تھی تاکہ ہر شخص اپنی انفرادی اور اجتماعی
 زندگی کو جماعت اور امام سے وابستہ رکھ کر وحدت امت کا تصور دل میں

جاگزین رکھے، محض مرکز کی طرف سے اعلان پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا یہ رسول
و رسول کی سنت پر لی جاتی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ ہمارے علماء و فقہاء
جو بیعت خدا و رسول کے نام پر کریں وہ رکھی ہو اور منافقت سے اللہ
اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان کی زبان پر آئے۔

خلافت قائمہ اور علماء و فقہاء امت کے مابین دوئی یا حریفانہ
ثابت کرنے کے لئے جتنی روایتیں وضع کی گئی ہیں وہ سب ملت اسلامیہ
اندرونی دشمنوں کی ساختہ پرداختہ ہیں اور بے احتیاط لوگوں نے ان
اپنی کتابوں میں درج کر دیا، کبھی عدم مبالاۃ کے سبب اور کبھی بالقصد
مقاصد کے تحت تاکہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سیاسی
اپنے اجماع سے قائم کیا تھا اس کی حجت مسلم نہ رہے۔

انسانی معاشرے میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں خصوصاً جب وہ
اتنا وسیع ہو کہ اس کی پہنائی میں کئی براعظم ہوں تو علماء و فقہاء کا ایک گروہ
رہنا چاہئے جو حکومت کے مناصب سے الگ رہے تاکہ ہر قسم کے لوگوں
بے تکلف استفادہ کر سکیں اور یوں امت میں اصلاح اور یک جہتی کی
قائم رکھنے کی سبیل ہمیشہ کھلی رہے۔ اسی لئے ہمارے بہت سے اکابر
اپنے آپ کو حکومت کے مناصب سے الگ رکھا۔

اور چونکہ علماء و فقہاء کا یہ بھی فرض ہے کہ امت کو غلط رویے
رکھیں اور قانون کی حکمرانی پر حریفانہ آئے دیں اس لئے یہ کثرت حضرات
حکومت کے مناصب لئے اور امت نے ان دونوں طبقوں سے پورا فائدہ
یوں ثقافت اسلامیہ سنام اعلیٰ تک پہنچی جس نے اہل عالم کو متاثر
کر دیا۔

ام ابو حنیفہؒ اور امیر حسن بن قحطیہؒ ۱۳۲-۱۳۳ھ میں انقلاب
حکومت کے بعد امام اعظم ابو حنیفہؒ
کے کہنے تشریف لائے، اور ۱۳۵ھ تک اپنے تدریسی اور تجارتی مشاغل
مہر و مت رہے۔ پھر اسی سال دارا بخلاذہ کی تعمیر کے سلسلے میں بغداد تشریف
لے گئے۔ ۱۳۵ھ تک قیام وہیں رہا۔ اسی سال آپ نے وفات پائی اور
ادۃ خلافت کے قبرستان میں دفن ہوئے جو بعد میں مقابر خیران کے
سے مشہور ہوا۔

پھر حال یہ تو کئی امام صاحب کی بات، اب امیر المؤمنین المنصورؒ کے
یہ سال اور دعوت کے مخلص کارکن امیر حسن بن قحطیہؒ کی بات ملاحظہ ہو
پنے والد ماجد امیر قحطیہؒ کی معیت میں ۱۳۲ھ سے بھی پہلے سے دور
علاقوں میں خلافت اسلامیہ کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اور
۱۳۵ھ سے لے کر ۱۶۸ھ تک شام اور آرمینیا کی گونا گوں جہیں سفر کرنے
شغول رہے۔ لیکن ہم یہاں اس دہائی داستان پر توجہ کرتے ہیں۔
ام ابو حنیفہؒ اور امیر حسن بن قحطیہؒ کی بابت بڑی آب و تاب سے بیان کی
ہے اور بعض مدعیان تحقیق نے اسے اہمیت دی ہے، قلاصبہ یہ ہے۔

امیر المؤمنین المنصورؒ کے مظالم میں ان کا ساتھ دے کر حسن
بن قحطیہؒ نے جو گناہ سمیٹے تھے۔ ان کا یو جھڑائیے ضمیر پر محسوس
کر کے اکھوں نے امام ابو حنیفہؒ کے ہاتھ پر توبہ کی۔ لیکن امام
نے فرمایا کہ تمہیں اپنی توبہ کا حقیقی ثبوت ابھی دینا ہے، چنانچہ
جب ۱۳۵ھ میں "نفس زکیہ" (محمد حسنی) کے خلاف المنصور
نے حسن بن قحطیہؒ کو لشکر لے جاتے کا حکم دیا تو امام ابو حنیفہؒ

نے فرمایا اپنی توبہ کے واقعی ہوتے کا ثبوت بہتیں دیتے کا وقت
اب آیا ہے۔ وہاں جانے سے انکار کر دو۔ اور اس خون ناحق
میں اپنے ہاتھ مت رنگو۔ ابن خطیب نے ایسا ہی کیا۔ اور
قید کر دے گئے۔

جن شخص نے یہ افسانہ گھڑا ہے، اسے اطمینان تھا کہ تاریخ کے ادراک
کو ن نگاہ ڈالتا ہے اور واقعی وہ اپنے گمان میں سچا تھا کیونکہ لوگ اس افسانہ
کو اچھا لکھتے تھے امام کی شیعیت یا شیعیت کی طرف میلان کے ثبوت میں
کرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے زمانے کے بزرگم خورشید ایک بہت بڑے مفکر اسلام
اپنی رسوائی عالم کتاب خلافت و بلوکیٹ میں پوری تفصیل سے اسے حجت
ہے اور بار بار محمد حسنی کو "نفس زکیہ" کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر
بولا ہے کہ آپ نے محمد حسنی کو ان کے مقتول ہونے سے سو سو برس پہلے ہی
جنازہ پڑھ کر "النفس الزکیہ" فرمایا تھا۔

مگر صحیح صورت حال یہ ہے کہ نہ کبھی امام صاحب اور امیر حسن بن خطیب کا
نہ انھیں محمد حسنی کے مقابلے پر جانے کا حکم دیا گیا اور نہ اس کا امکان تھا کہ
میں امام صاحب کسی سے اس کی توبہ کی واقعیت کا ثبوت طلب کرتے کے لئے
محمد حسنی کے مقابلے پر جانے سے روکیں۔ کیونکہ امام صاحب اس وقت بغداد میں
نہ کوئے میں اور امیر المؤمنین کے حضور ان کی خدمت انجام دیتے ہیں مشفق
تھے نہ کہ ان کے خلاف کسی سیاسی جوڑ توڑ میں اور امیر حسن بن خطیب بھی
وقت بغداد کوئے سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر اپنی خدایات انجام دے رہے تھے
محمد حسنی کے خلاف جو فوجی دستہ بھیجا گیا تھا وہ تادیبی مقصد سے بھیجا
کے لئے نہیں بھیجا گیا تھا، اسی لئے امیر المؤمنین نے اس کی کمان کسی غیر با شمی

دی بلکہ اپنے سگے بھتیجے کے سپرد کی اور ہاشمی سادات کا ایک گروہ ان کے ساتھ کر دیا تاکہ جہاں تک ممکن ہو خون خرابے کی نوبت نہ آئے اور اپنے خاندان کے افراد کے سمجھانے سے وہ راہ راست پر آجائیں کسی غیر ہاشمی کی کہان میں یہ دستہ بھیجنے سے یہ مقصد ہی قوت ہو جاتا۔ اور نہ یہ ہم ہی ایسی تھی کہ امیر حسن بن فخریہ کو سیکڑوں میل دور کے علاقے سے طلب کر کے وہاں بھیجنا ضروری ہوتا طبری کا بیان ہے بذیل وقائع ۱۴۵-۱۵۰ھ اور اس کی توثیق دوسرے مورخوں کے علاوہ یا قوت حموی کے بیان سے بھی ہوتی ہے، جو انھوں نے

تعمیر بغداد کے سلسلے میں لکھا ہے (معجم البلدان جز ۴، ص ۶۶، طبع بیروت۔

رامیر المؤمنین) المنصور نے حکم دیا کہ کاریگروں

اور ستروں کو شام، موصل، جبال، کوفہ

واسط اور بصرے سے جمع کیا جائے

چنانچہ یہ لوگ حاضر کر دیے گئے ایسے

لوگوں کو متعین کرتے کا حکم دیا جو اپنی

فضیلت، عدالت، دین کی سمجھ، انیت

اور فن تعمیر میں جہارت رکھتے ہوں۔

چنانچہ جو حضرات حاضر ہوئے ان میں

حجاج بن ارطاة اور ابو حنیفہ نعمان

بن ثابت بھی تھے۔ پھر آئے شہر کی

دارغ میل ڈالتے، بنیادیں کھودنے

انیشیں بتاتے اور چونا پکانے کا حکم

دیا اور یہ کام شروع کر دیا گیا پہلے پہل

ان المنصور وجه فی حشر

الصناع والفعل من الشا

والموصل والجبیل والكوفة

واسط والبصرة فاحضر

وامر باختیار قوم من ذوی

الفضل والعدالة والفقہ و

الامانة والمعرفة بالهندسة

فکان ممن حضر لذلك

الحجاج بن ارطاة وابو حنیفة

النعمان بن ثابت وامر بحط

المدينة وحفر الاساسات

وضرب اللبن وطبخ الاجر

فبدی ذلك۔ واول ما ابتد

بہار فی عملہا سنہ ۱۲۵ھ اس کام کی ابتداء سنہ ۱۲۵ھ میں ہوئی

یعنی جس وقت محمد حسنی اور ان کے بعد ان کے بھائی ابراہیم نے خروج و بغاوت کا اقدام کیا، اس وقت امام صاحب، یار گاہ خلافت میں حاضر تھے اور تعمیر کے کام کی نگرانی کے علاوہ امیر المؤمنین نے دوسری خدمات بھی ان کے سپرد کر دی تھیں، جیسا کہ دوسری جگہ ہم نے بیان کیا ہے۔

اس زمانے میں امیر حسن بن قحطیبہ کی بابت حسب ذیل تصریحات ہیں۔

۱۔ سنہ ۱۳۶ھ میں حسن بن قحطیبہ آرمینیا میں متعین تھے اور سنہ ۱۳۷ھ میں امیر المؤمنین کے چچا عبداللہ بن علی السجاد کی بغاوت فرو کرنے کے لئے ابو مسلم خراسانی کا ساتھ دینے موہل آئے اور یہ ہم سر کر کے پھر آرمینیا چلے گئے (طبری ج ۳، ص ۴۴، ۴۵، ترجمہ) اسی جہم میں ابو مسلم کی تخریبی اور باغیانہ عزائم کا کچا چٹھا لکھ کر انھوں نے حضرت امیر المؤمنین کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔

۲۔ سنہ ۱۳۸ھ میں جب نصرانی بادشاہ نے شام کے علاقوں پر حملہ کیا، تو امیر حسن بن قحطیبہ کی مدد کے لئے امیر مؤمنین کے چچا امیر صالح بن علی السجاد اور ان کے بھتیجے امیر عباس بن محمد الامام، ایک فوج گراں لے کر روانہ ہوئے اس جہاد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خاندانہ خلافت کی دو خاتون بھی شریک تھیں۔ یعنی امام علی السجاد کی صاحبزادیاں سیدہ ام عیسیٰ اور سیدہ لبابہؑ

۳۔ سنہ ۱۳۹ھ میں ابراہیم الامام کے فرزند امیر عبدالوہاب عیسیٰ نے امیر حسن بن قحطیبہ کے ساتھ دوبارہ رومیوں کے خلاف جہاد کیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۱۰ ص ۴۴۷)

۴۔ سنہ ۱۳۹ھ میں امیر عباس بن محمد الامام کی معیت میں حسن بن قحطیبہ نے رومیوں کے خلاف ایک اور جہاد کیا (طبری ج ۳، ص ۳۳۵، ترجمہ)

(۵) امیر المؤمنین محمد المہدی عیاسیؑ کے عہد میں حبش رومیوں نے اسلامی شہروں پر یلغار کی تو امیر حسن بن قحطیبہ نے تیس ہزار باقاعدہ سپاہ اور ہزاروں رضا کاروں کے ساتھ روم کے خلافت جہاد کیا۔ (طبری ج ۳، ص ۴۶۶)

۶۔ اسی طرح خود امیر المؤمنین المہدیؑ نے جب ۱۶۳ھ میں ولی عہد خلافت ابو جعفر ہارون الرشیدؑ کو ساتھ لے کر رومیوں کے خلافت جہاد کیا تو دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ امیر حسن بن قحطیبہ بھی اس لشکر میں تھے۔ وکان فی ہذا الجیش الحسن بن قحطیبہ (البدایہ)۔

غرض یہ ہے کہ نہ محض امیر المؤمنین المنصورؑ کے زمانے میں بلکہ ان کے فرزند عہد میں بھی حسن بن قحطیبہ ایسے دور کے علاقوں میں اور ایسی جہموں میں مشغول رہے کہ نہ ۱۳۲ھ سے ۱۴۵ھ تک اور نہ ۱۴۵ھ سے ۱۵۰ھ تک اسکا کوئی موقع تھا کہ امام ابو حنیفہؒ اور امیر حسن بن قحطیبہ یک جا ہوں، اور نہ محمد حنی کے خروج کے وقت امام صاحب کو نے میں تھے۔ اور نہ حسن بن قحطیبہ کبھی قید کئے گئے۔ اگر اللہ کی راہ میں جہاد، خلفاء اسلام کا ظلم تھا اور اس میں شرکت موعیت، تو بیشک امیر حسن بن قحطیبہ نے بڑے گناہ کمائے اور ظلم ڈھائے جن سے ان پر توبہ لازم تھی!۔

خدا سمجھے ان اہل قلم سے جو ہماری تاریخ کو اس طرح مسخ کرتے ہیں لیکن یہ کرامت صحابہ کرام اور خلفاء عظام کی ہے کہ ملت کے اندرونی دشمنوں نے جتنی دانتیں وضع کیں ان میں ان جھوٹوں کو روایت وضع کرتے کے سلیقے سے اللہ تعالیٰ نے محروم رکھا۔ کیونکہ یہ ایسی بے پر کی اڑاتے ہیں کہ تاریخ کے صفحات کا سرسری مطالعہ کرتے والا بھی ہنس پڑے۔

غرضیکہ امام ابو حنیفہؒ پر یہ افتراء کہ انھوں نے حکومت کے فوجی افسر کو

عدول حکمی پر ابھارا تھا محض بے بنیاد اور من گھڑت ہے۔

امام ابو حنیفہ اور محمد الارقط حسنی

خلافت عباسیہ ۱۳۱ھ میں قائم ہوئی، اندلس کے علاوہ تمام

عالم اسلام اس کی بیعت میں داخل ہو گیا۔ امیر المؤمنین المنصور عباسی کو مندر خلافت پر متمکن ہوئے آٹھ برس ہو چکے تھے کہ محمد الارقط بن عبد اللہ بن الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب نے بغاوت کر دی۔ کہتے ہیں کہ انکے بھائی ابراہیم بھی اس سازش میں شریک تھے۔ پھر کہتے ہیں کہ دونوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ مدینہ طیبہ اور بصرے میں بیک وقت خروج کیا جائے۔ ان دونوں نے امیر المؤمنین سے بیعت نہیں کی تھی۔ اور ردپوش تھے۔ مگر ان کے اور عزیز تیران کے والد عبد اللہ المحض نے امیر المؤمنین السفاح اور امیر المؤمنین المنصور دونوں سے بیعت کی تھی۔ دونوں کے ہاں ان کا احترام تھا اور خصوصی تعلقات تھے، اپنے بیٹوں کو انکا کوہہ غیر اہم بتا کر آئندہ بیعت کے لئے انھیں ہموار کرتے کا اطمینان دلایا کرتے تھے۔ مگر انھیں یہ سب باتیں محض برائے گفتن، وہ پوری طرح اپنے فرزندوں کے عزائم میں ان کے ہم نوا تھے۔

حصول حکومت کی ترپ ان میں اس وقت پیدا ہوئی جب دعوت عباسیہ کامیاب ہو گئی۔ اور بنو عباس خلافت پر فائز ہو گئے۔ اب انھوں نے بھی یہی ترکیب چلنی چاہی کہ خفیہ خفیہ اپنے ہم نوا پیدا کریں۔ لیکن کام کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ اور امت میں خلافت عباسیہ اتنی مقبول تھی کہ انھیں اپنے حمایتی ممبر نہ آ سکے۔ امیر المؤمنین المنصور کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اپنی آدمیوں کو ان لوگوں کے پاس اس مقصد سے بھیجا کہ اپنے آپ کو شیعوہ علیؑ ظاہر کر کے سب معلومات حاصل کریں۔ چنانچہ بقول طبری حجت قائم کرنے کے لئے عقیدہ زیدی

کہ ”شیبہ علی“ کی طرف سے ایک نیاز مندانہ خط اور روپیہ دے کر عبداللہ المحض کے پاس بھیجا گیا اور ہدایت کی گئی کہ اپنا اعتبار قائم کر کے اکھنیں روپیہ دیتا اور تحریری جواب بھی لاتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ المحض نے روپیہ لے لیا مگر خط کا جواب لکھنے کے بجائے کہا کہ ہم ان لوگوں کو جانتے نہیں۔ اس لئے تحریر نہیں دے سکتے۔ البتہ ہمارا سلام اکھنیں پہونچا دیتا۔

امیر المؤمنین المنصور حجب حج کے موقعہ پر مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تمام ہاشمی سادات نے خیر مقدم کی سعادت حاصل کی عبداللہ المحض بھی آئے اپنے خلیفہ المنصور نے ان کی خوب مدارات کی۔ بعد میں دریافت کیا تم اپنے عہد و قاپر قائم ہو، حکومت کے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہے؟ اکھنوں نے جواب دیا بیشک میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔ امیر المؤمنین نے عقیدہ کو سامنے آنے کا اشارہ کیا، اے دیکھتے ہی عبداللہ گھبرا گئے۔ دوزخ ہو کر امیر المؤمنین سے معافی کی التجا کی۔ مگر اکھنیں قید کر دیا گیا اور ان کے ساتھ ان کے دو ایک عزیزوں کو بھی جو اس سازش میں ملوث تھے۔

اب سوچنا چاہئے کہ ان لوگوں کے عزائم تو تھے انقلاب لا کر علوی حکومت قائم کرنے کے، لیکن جہاں تک اسباب فراہم کرنے، اپنے حق میں رائے عامہ استوار کرنے اور خروج کے لئے موزوں وقت متعین کرنے کا سوال ہے تو اس کی اکھنوں نے چند ضرورت نہیں سمجھی۔ روپیہ اور خط وصول کر لیا اور جن شیعہوں کو جانتے تک نہ تھے انہیں سلام بھی کہلوادیا۔ مگر اس تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ شیعہ کہاں ہیں کتنے ہیں۔ ان کی وفاداری کس حد تک اطمینان بخش ہے اور ان کے وسائل سے انقلابی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں یا نہیں

یہ لوگ اس خیالی دنیا میں رہ کر خروج کر بیٹھتے۔ برخلاف ان کے

دعوت عباسیہ نے تین تیس برس کی ہمہ گیر کوششوں کے بعد تمام عالم اسلام کی حمایت حاصل کر کے دو براعظموں پر اپنا پرچم لہرایا۔ کہاں دعوت عباسیہ ایک عوامی تحریک، اور اس کی ہمہ گیر کامیابی اور کہاں محمد بن عبد اللہ حسنی الملقب بہ الارقط کے دعوت کی محض یہ بنیاد کہ ”مجھے ہاشم نے دودنہ جہا ہے، عبدالمطلب نے دودنہ جہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودنہ جہا ہے اور حضرت علی نے دودنہ جہا ہے اور میں اس کا بیٹا ہوں جو میرے پہلے ایمان لایا یعنی ان کے خیال میں حضرت علیؓ اور میں اس کا پوتا ہوں چہرے سب سے کم عذاب ہے یعنی ابوطالب۔“ اس نسلی اور شخصی فضیلت جتانے کو انھوں نے خلافت کی اہلیت قرار دیا۔ مگر یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ امت بھی ان تعلیوں پر کان دہرتی ہے یا نہیں۔ حصول حکومت کے لئے جو سب سے اہم بلکہ واحد شرط ہے یعنی رائے عامہ کی اپنے حق میں استواری اس کی طرف سے یہ لوگ ہمیشہ غافل رہے۔ اس لئے پیہم و متواتر ناکامی اور نامرادی ان کا مقدر رہی۔

محمد حسنی الملقب بہ الارقط نے جنہیں سبائیہ نے ”نفس الزکیہ“ کا خطاب دے رکھا ہے اور خود انھوں نے اپنے کو ”تہدی“ بھی کہلوا یا کھا۔ علم سیاست اور آداب جنگ سے قطعاً بے نیاز ہونے کا ثبوت یہ دیا کہ ان کے خیال میں ان کے شیعوں کی موہوم ہستیاں تو کھتیں بلادعجم میں اور بغادت کا جھنڈا بلند کر بیٹھے، مدینہ طیبہ میں۔ حالانکہ اہل مدینہ کی بیماری اکثریت ان کے خلاف تھی۔ کچھ لوگ جو ان کے ساتھ ہو گئے تھے وہ اتنے بھی نہ تھے کہ دوچار کھنڈ ہی عسکر خلافت کا مقابلہ کر سکیں۔

امیر المؤمنین المنصور نے یہ فتنہ فرو کرنے کے لئے جو فوجی دستہ مدینہ

طیبہ بھیچا تھا، اس کی کمان اپنے سگے بیٹے امیر علی بن موسیٰ بن محمد الامام عباسی کے سپرد کی تھی اور یہ اہتمام کیا تھا کہ کوئی ہاشمی گھراتا ایسا نہ رہے جس کے افراد اس شے میں نہ ہوں۔ ان میں سے طبری وغیرہ کے بیان کردہ چند طالبی حضرات کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ قاسم بن حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب

۲۔ عبداللہ بن الحسین الاضرع بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب

۳۔ عمر بن محمد بن عمر بن علی ابن ابی طالب (۴) عبداللہ بن محمد بن عمر بن

علی بن ابی طالب (۵) عبداللہ بن اسماعیل بن عبداللہ بن جعفر بن ابی

طالب (۶) محمد ابو الکرام بن عبداللہ بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب

(۷) قاسم بن عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب (۸) ابو عقیل محمد بن عبداللہ بن

محمد بن عقیل بن ابی طالب، وغیرہم ان حضرات میں دیکھیں شرکت امیر محمد عباسی بن امیر المؤمنین ابو العباس السفاح کی تھی جو اپنی محمد بن الارقط عبداللہ حسنی کے داماد تھے۔

اس دستے کی ترتیب سے غرض یہ تھی کہ اپنے گھر والوں اور قریب ترین

عزیزوں کے سمجھانے سے شاید محمد الارقط حسنی راہ راست پر آجائیں۔

تین دن ان حضرات نے امان پیش کی اور باغیوں کو ہر چند سمجھایا کہ اس غلط

اور تباہ کن اقدام سے باز رہیں مگر وہ نہ مانے۔ البتہ بعض حضرات ان کا ساتھ

چھوڑ کر شہر کو واپس چلے گئے۔ اب بھی وقت تھا کہ اپنی سورت بدیرا دیے سرو

سامانی سے غیرت پکڑیں۔ مگر تیز اندازی شروع کر دی۔ اس پر ان کے ابن عم

قاسم بن حسن نے امیر علی بن موسیٰ سے کہا کہ حجت پوری ہو گئی اور اب قوت سے جواب

دینا چاہئے۔ چنانچہ رن پڑا اور محمد الارقط بڑی بہادری سے لڑے۔ حتیٰ کہ

جب تنہا رہ گئے اور ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا تب بھی میدان نہ ہٹے

گرتا ہونے کی بجائے بے ہنگری سے جان دی۔ عفی اللہ عنہ

ان کی فوج میں بھگدر پہلے ہی حج گئی تھی۔ کیونکہ ادھر ہنگامہ بپا ہوا اور
ادھر سیدہ اسماء بنت حبیب بن عبد اللہ بن عبد اللہ ابن عباسؓ نے اپنی سیاہ
چادر مسجد نبوی کے مناسے پر لہرا دی۔ باغی سمجھے کہ شہر پر عسکر خلافت کا قبضہ
ہو گیا۔ اور مقاومت قبول ہے۔ بہر حال یہ حادثہ فاجعہ ہوا۔ اور بے وجہ قہر
جانیں ضائع ہوئیں۔ ان کے قتل کے بعد ان کی ہمیشہ سیدہ زینب اور
صاحبزادی سیدہ فاطمہ نے امیر عیسیٰ کے پاس پیغام بھیجا کہ جو ہونا تھا وہ
ہو گیا اب مقتول کی تدفین کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ حسب روایت
طبری انھیں با احترام جنت البقیع میں سرکاری اہتمام سے دفن کر دیا گیا۔
ان کا سر کاٹنے اور بغداد بھیجنے کی سب روایتیں باطل ہیں۔ امیر المؤمنین نے
فوجی دستہ روانہ کرتے وقت اپنے بھتیجے سے فرمایا تھا رطری نیز البلاء
والنہایہ

”عیسیٰ! میں تمہیں اپنے پھلوؤں کے درمیان (پرچھا مارنے)
بھیج رہا ہوں۔ اس شخص پر اگر قابو پاؤ۔ تو تلوار میان
میں کر کے امان کا اعلان کر دینا۔“

یعنی ان کی قرابت قریبہ اور شخصی احترام کا خیال رکھنا جہاں تک ممکن
ہو خوں ریزی سے بچنا۔ اور حرم شریف کی حرمت پر حرج نہ آنے دینا ایسی
صورت میں اگر اہل ذرا لوگوں کے اس بیان میں کیا صداقت ہو سکتی ہے
کہ ان کا سر کاٹا گیا اور جثہ یہود کے قبرستان میں پھینک دیا گیا۔ ان کے
دادا اور بھائی بھتیجوں کی موجودگی میں نہ ان کا سر کاٹا جاسکتا تھا اور نہ
ان کی لاش کی بے حرمتی کا امکان تھا۔ پھر اس وقت یہود کے مقابر ہی کہاں

تھے۔ ڈیڑھ سو برس پہلے ہی وہ برابر کر دے گئے تھے اور ان کا نام و نشان
بھی نہ تھا۔ رجاء مع ترمذی۔ ج ۱ ص ۱۲۵، باب لتوۃ القبور، طبع مجتبیٰ
دہلی)

عن ابی وائل ان علیا قال
لا بی الھیاج الاسدی
ابعتک علی ما بعثنی الینی صلی
اللہ علیہ وسلم ان لا تدفع
قبرا مشرفا الا سویتہ و
لا تمثال الا طمسہ
حضرت ابو وائلؓ سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ
نے ابو الہیاج ابدی سے فرمایا، میں
تمہیں اسی کام کے لئے بھیجتا ہوں جس کیلئے
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا کہ
کوئی نمایاں قبر ایسی نہ رہے جسے تم برابر نہ
کردو۔ اور نہ کوئی بت ایسا نہ رہے جسے تم
سمار نہ کردو۔

حضرت علیؓ کا مذہب ہی یہ ہے اور خود انکی قبر کا تو صحیح طور سے کہیں
نام و نشان نہیں۔ محمد الارقط حسنی کی لاش کی بابت سب باتیں کر ملنا
کی داستانوں کی طرح عوام الناس کے ہذیات بھڑکانے کے لئے وضع
کی گئی ہیں۔ محمد حسنی کی بغارت کو جہاد کی رفعت دینے کی کوشش بھی
اسی لئے کی جاتی ہے۔

ایک اور افتراء
شیعی راویوں اور تخریب پسند مصنفوں نے اس وضعی
روایت کو بڑی شہرت دی ہے کہ امام مالکؒ نے
محمد الارقط بن عبد اللہ حسنی کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا۔ چنانچہ عمدة الطالبا
کے مصنف کہتے ہیں۔

وکان مالک بن انس لفقہ
قد افقی الناس بالحدوج
مالک بن انس فقیہ نے لوگوں کو محمد
کے ساتھ ہو کر خروج کا فتویٰ دیا

مع محمد و یا یحییٰ و لذلک
تغیر المنصور علیہ

دیا تھا اور ان سے بیعت کر لی تھی
اسی لئے المنصور ان سے بکر لگا

یہ افتراء محض ہے اور امام مالکؒ کے کھلے ہوئے مذہب کے بالکل خلاف
پھر سوال ہے کہ اکھنوں نے اگر خروج کا فتویٰ دیا تھا اور بیعت کر لی تھی تو
”جہاد“ میں شریک کیوں نہیں ہوئے۔ اتنی بڑی بات کہ امت کے متفق علیہ
کی بیعت تو ردین اور پھر جس سے بیعت کی ہے اس کا ساتھ بھی نہ دیں، اس
ناشایستہ ہے کہ امام مالکؒ جیسے عظیم المرتبت فقیہ کے متعلق سوچی بھی نہیں
وہ تو اپنے مذہب میں اتنے سخت ہیں اور مسلمانوں کے باہمی نزاع سے اتنے
متنفر کہ ایک شخص نے جب ان سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی بایں
پوچھا کہ ان میں افضل کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا وہ جس شخص نے تلوار
یعنی حضرت علیؓ نے، میں اسے اس شخص سے افضل کیسے کہہ سکتا ہوں
”تلوار نہیں اٹھائی“ (یعنی حضرت عثمانؓ ذی النورین نے)

طبری نے بھی اس ضمن میں دو متضاد روایتیں لکھی ہیں راجح منظر
ایک تو یہی جو اوپر گزری ذرا تفصیل کے ساتھ اور دوسری بالکل اسکے
اخبرنی غیر واحد ان مالک

مجھ سے کئی آدمیوں نے بیان کیا ہے
کہ مالک ابن انس سے محمد کے
خروج کی بابت فتویٰ پوچھا گیا
ان سے کہا گیا کہ ہماری گردلوں
الوجعفر کی بیعت ہے تو اکھنوں
فرمایا تم سے یہ بیعت زبردستی لی

ابن انس استفتی فی الخروج
مع محمد و قبل لہ ان
اعتاقنا بیعة لابی جعفر
فقال انما یا یعتم مکرہین
ولیس علی کل مکرہ یحییٰ
فاسرع الناس الی محمد و

لزم مالک بیتہ

اور مجبوری کی حالت میں کسی پر کسی قسم کی

ذمہ داری نہیں۔ لہذا لوگ محمد کی طرف دوڑ پڑے اور مالک اپنے گھر میں بیٹھ رہے۔
کن لوگوں نے یہ بیان کیا اور وہ تھے کس حیثیت کے اس کا کچھ ذکر نہیں۔ پھر
سوال ہے کہ خود امام مالکؒ نے خلیفہ المنصورؒ سے بیعت خوشی سے کی تھی یا مجبوراً
اس کا بھی ذکر نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اہل مدینہ سے جبراً بیعت لینے
کی صورت کیا تھی۔ یعنی ایک ایک آدمی کو گرفتار کر کے لایا جاتا تھا کہ بیعت کرے،
اور اس طرح سب بنو ہاشم اور ہاشم بن واصلہ کی اولاد نے تلوار کے دھڑ سے
بیعت کی تھی اور آٹھ برس سے اس جبر سے بیعت پر صابر و شاکر بیٹھے تھے، غنیمت
دنی سے حصے بھی لیتے تھے اور دیوان فاروقی کے مطابق وظیفہ بھی اور پھر کہتے
تھے کہ ہم اس حکومت سے راضی نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ بیعت جبراً
لی گئی تھی، نہ اہل مدینہ کی اکثریت نے بیعت توڑی۔ نہ امام مالکؒ نے ایسا
لغو فتویٰ دیا اور اگر دیتے تو گھر میں نہ جاسکتے۔

اب طبری کی دوسری روایت ہے۔ (ص ۱۷۳)

لما حج ابو جعفر ارسل محمد بن
عمران بن ابراہیم بن محمد
بن طلحہ و مالک بن انس الی
اصحابنا فساء لہم ان ینفخوا
الیہ شحداً و ابراہیم بنی
عبد اللہ ...

جب امیر المؤمنین (ابو جعفر) حج کیلئے آئے
تو اپنے محمد بن عمران بن ابراہیم بن محمد بن
طلحہؒ اور امام مالکؒ بن انس کو ہمراہ
آدمیوں کے پاس بھیجا اور ان سے مطالبہ کیا
کہ عبداللہ کے دونوں فرزندوں محمدؒ و ابراہیمؒ
کو امیر المؤمنین کے حوالے کر دیں۔

گویا اس روایت کے مطابق امام مالکؒ نے محض یہی نہیں کہا کہ امیر المؤمنین
سے بخوش دلی بیعت کی تھی بلکہ وہ ان کے معتد کارکن بھی سمجھے اور چاہتے تھے کہ

لوگ اس بیعت کی حرمت کو برقرار رکھ کر باغیوں کو اپنے متفق علیہ امام کے سپرد کر دیں
امام مالکؒ کے گھر میں بیٹھ رہتے تھے بھی اسی کی توفیق ہوتی ہے کیونکہ عملاً محمدؐ کا ساتھ
نہ دینا آپ کے بارے میں متفق علیہ ہے۔

یہ ہے اہل تاریخ کی تضاد بیانی اور حیرت ان پر ہوتی ہے کہ جو روایت
واقعات کے مطابق ہو اسے رد کر کے ایسی روایت کو شہرت دیتے ہیں جس کا کوئی
عملی ثبوت نہ دے سکیں۔ امام مالکؒ نے اگر فتویٰ دیا ہوتا اور اس کی پذیرائی
میں لوگ محمد الارقطہؒ کی کا ساتھ دیتے کے لئے دوڑ پڑتے تو کیا یہ نتیجہ نکلتا
جو نکلا کہ دو تین گھنٹے بھی مقابلہ نہ کیا جاسکا۔ لہذا ناممکن ہے کہ انھوں نے
ایسا کوئی فتویٰ دیا ہو یا اہل مدینہ کی اکثریت نے بیعت توڑی ہو۔ امام مالکؒ
تو اس وقت امیر المؤمنین المنصورؒ کے فرمان کے مطابق موطا شریف کی تدوین
میں مشغول تھے۔ انھیں اس خالص تخریبی ہنگامے سے کیا دل چسپی ہو سکتی تھی۔
جو نصوص صریحہ و ثابۃ کے خلاف تھا اور خود ان کے کھلے ہوئے مذہب کے بھی
خلاف۔

عمدة الطالب کے مصنف کی یہ بھی صریح غلط بیانی ہے کہ امیر المؤمنین
المنصورؒ کا دل امام مالکؒ سے پھر گیا تھا۔ کیونکہ صفحہ ۱۸ پر دیکھا جاسکتا
ہے کہ امیر المؤمنین نے موطا شریف کی تدوین کی خدمت ان کے سپرد کی تھی۔
اور جو فرمان اکھیر بھیجا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں "مقدمہ ابن خلدون" ص ۱۸
طبع مصر

اے ابو عبد اللہ! اس وقت رونے زمین
پر چھوڑے اور آپ سے بڑا کوئی عالم نہیں
مجھے تو خلافت نے مشغول کر رکھا ہے

یا ابا عبد اللہ! لعمریٰ علی وجہ
الارض اعلم منی و متک وانی
قد شغلتنی الخلافة فضع

انت للناس کتابا ینتفعون به
تجنب فیہ عن رخص بن عیا
وشدائد ابن عمر۔ ووطئ
لناس توطأة۔ قال مالک
فوالله لقد علمنی لتصنیف
یومئذ۔ ولذا سمی کتاب
الموطاء۔

ہذا آپ لوگوں کے لئے ایک کتاب
مدون کیجئے جس سے وہ نفع اٹھانے میں
اس میں حضرت ابن عباسؓ کی ترقی
اور حضرت ابن عمرؓ کی سختی سے پرہیز کیجئے
اور اسے لوگوں کے لئے خوب خوب
روندے (یعنی بغایت تحقیق کیجئے)
امام مالکؒ فرماتے ہیں بخدا اس طرح
اکھوں نے مجھے تصنیف کا طریقہ سکھا دیا اور اسی لئے آپ نے کتاب کا نام الموطاء
رکھا (خوب روندی ہوئی یعنی بغایت تحقیق)

بعض مورخوں نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ فرمان میں
حضرت ابن مسعودؓ کا بھی نام لیا ہے کہ ان کے غرائب سے بچیں۔ یعنی ان مسائل
سے جو دوسرے صحابہ کے یہاں معروف نہ ہوں۔ پھر فرمان میں یہ الفاظ بھی
نقل کئے ہیں کہ اوسط امور کا خیال رکھئے اور صحابہ کے اجماعی مسائل مدون
کیجئے۔ اس انداز میں جس شخص کو جناب کیا جائے تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ کتاب
کے دل میں اس کی عظمت اور اہمیت کا احساس نہ تھا اور کیسے کہہ سکتے ہیں کہ
امیر المؤمنین کا دل ان سے پھر گیا تھا۔ ان کا دل بے وجہ کیوں پھرتا، اور اگر
پھرتا تو اس کے کچھ آثار تو ہوتے۔

جو امر عیاں ہے وہ یہ کہ موطا شریف کو قرآن مجید کے بعد عالم اسلام
میں دستور اساسی کی حیثیت حاصل ہوئی اور مشرق و مغرب میں اسے مستند
سمجھا گیا۔ یعنی اس کی جو مقبولیت خلافت عباسیہ میں گئی وہی اندلس کی اموی
امارت و خلافت میں اسے حاصل رہی۔ امیر المؤمنین المنصورؒ کی زندگی میں

کتاب مکمل نہ ہو سکی لیکن خلفاء اسلام میں سے پانچ نے اس کی سماعت خود امام
مالکؒ سے کی ہے یعنی خلیفہ المہدیؒ، الہادیؒ، الرشیدؒ اور الامینؒ اور اماموں نے
امام مالکؒ اور ان کی اس کتاب کی عظمت امیر المؤمنین ہارون الرشیدؒ
کے ہاں اتنی تھی کہ خلیفہ ہونے کے بعد محض اس کی سماعت کے لئے اپنے دونوں
فرزندوں کے ساتھ مدینہ طیبہ کا سفر کیا تھا۔ پھر جب سلطان غازی صلاح الدین
الایوبیؒ کو معلوم ہوا۔ امیر المؤمنین ہارون الرشیدؒ نے موطا شریف کے حسن
نسخے کی سماعت کی تھی وہ مصر کے خزانے میں محفوظ ہے، تو ان کی پیروی کی
برکت حاصل کرنے کے لئے آئے اس نسخہ سے سماعت کے لئے مصر کا سفر کیا ان
دونوں شخصیتوں کے علاوہ غالباً کسی تیسرے کا نام نہیں لیا جاسکتا جس نے
حکومت پر فائز ہونے کے بعد طلب علم کے لئے سفر کیا ہو۔ (تاریخ الخلفاء
ص ۲۹۲، طبع مصر)

امام مالکؒ کا عمل اگر وہ ہوتا جو شیعہ مصنفوں نے بیان کیا ہے اور
دوسروں نے اسے شہرت دی تو نہ عالم اسلام میں ان کی یہ حیثیت تسلیم کی جاتی
کہ لوگ ہجوم کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور نہ خلفاء کرام کے یہاں
ان کا یہ احترام ہوتا، کیونکہ ان کا شمار پھر یا غیوں میں ہو جاتا جن کے قاضی
کے فیصلے قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ گواہوں کی گواہی۔

اب دیکھیں یہ بات یہ ہے کہ شیعہ مصنفوں نے جعفر الصادقؒ کے موقف
کی اشاعت پر توجہ نہ کی جو اس وقت خاص مدینے میں موجود تھے لیکن امام
مالکؒ پر اس خیالی فتویٰ کا بہتان رکھ کر اسے خوب اچھالا، اور اس طرح
عملاً ثابت کر دیا کہ اہل مدینہ کے یہاں فتویٰ امام مالکؒ کا چلتا تھا۔ ہمارے
نزدیک امام مالکؒ نے فتویٰ ضرور دیا ہو گا مگر وہی جو ان کے کھلے مذہب کے مطابق

کہ گھروں میں بیٹھیں اور اس شورش میں شریک نہ ہوں اسی پر آپ نے خود بھی عمل کیا اور اہل مدینہ کی اکثریت نے بھی۔ حتیٰ کہ جو کھوڑے لوگ محمد الارقط کے ساتھ میدان میں نکلے تھے وہ بھی تائب ہو کر واپس ہو گئے اور اگر خود محمد الارقط تائب ہو جاتے تو یہ حادثہ کیوں رونما ہوتا۔

یعقوبی افسانہ اموی اور عباسی خلافتوں کے غیر آئینی اور محمد الارقط حسنی کی بغاوت کو قالونی حیثیت دینے کے لیے شیوخ مورخ یعقوبی نے یہ افسانہ گھڑا ہے کہ :-

۱۔ بنو ہاشم کا ایک خفیہ ایلاس ہوا۔ جس میں ابو جعفر المنصور بھی تشریف رکھتے تھے۔ وہاں اموی خلافت کے متوازی خلافت قائم کرنے کے لئے محمد حسنی کا انتخاب کیا گیا اور سب نے مع ابو جعفر المنصور ان سے بیعت کر لی۔ اس ایلاس میں شرکت کیلئے ابو جعفر الصادق کو بھی بلایا گیا تھا۔ مگر انھوں نے یہ صورت حال دیکھ کر فرمایا کہ یہ منصب آپ میں کسی کو نہ ملے گا، یہ تو اس زرد قبائلی کا حق ہے یعنی ابو جعفر المنصور کا، اسی وقت سے المنصور کے دل میں حصول خلافت کا جذبہ پیدا ہوا۔

یہ روایت از سر تا پای صحیح محض ہے۔

۲۔ سب بنو ہاشم ایسے بے اصول اور منافق نہ تھے کہ علانیہ تو خدا و رسول کے نام پر بیعت کریں، ان کے جائز اور آئینی امام ہوتے کا اقرار کریں اور خفیہ خفیہ حریف خلافت بھی قائم کر ڈالیں اور وہ بھی بغیر وسائل کے، قرآن حکیم نے ایسی خفیہ کارروائیوں پر سخت توہین کی ہے۔ کیونکہ یہ امت کے ساتھ غداری ہے۔

۲۔ جعفر الصادقؑ اور ان کے والد ماجد خالصؑ غیر سیاسی اور علمی زندگی بسر کرتے تھے اور صمیم قلب سے خلفاء کی بیعت پر مستقیم رہے، سیاسی ہنگامہ آرائی ان کے مسلک کے خلاف تھی۔ اس لئے ناممکن ہے کہ ایسے تخریبی اہلاس میں شرکت فرمائے۔

۳۔ ابو جعفر المنصورؑ کے گھرانے کی اپنی تحریک سا لہا سال پہلے سے خالص تعمیری انداز میں چل رہی تھی جس میں قواعد شرعیہ کا پورا احاطہ رکھا جاتا تھا۔ اسی لئے اس کا امکان نہ تھا کہ وہ اپنے برادر بزرگ، والد ماجد اور جد امجد کی عالم گیر عوامی تحریک کو نقصان پہنچانے اور اسے تخریبی رنگ دینے کے لئے ایسے یا غیاثہ اہلاس میں شریک ہوتے۔

۴۔ اس روایت کے پیچ محض ہونے کی عملی دلیل یہ ہے کہ امیر المومنین المنصورؑ کی ولادت ۹۵ھ کی ہے یعنی آپ عہد صحابہ میں پیدا ہوئے تھے دعوت عباسیہ سنہ ۱۱۰ھ میں شروع کی گئی۔ اس وقت آپ کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ اور ایسا بچہ کسی زیر دست سیاسی اہلاس میں کیسے پہنچ جاتا غرض یہ ہے کہ یعقوبی نے اس فرضی اور خیالی اہلاس کے انعقاد کا افسانہ نہایت بے عقلی سے گھڑا ہے جسے دیگر مورخین خصوصاً شیعہ مؤلفین نقل کرتے رہے ہیں۔ نہ دعوت کی ابتداء سے پہلے ایسے کسی اہلاس کا امکان تھا کیونکہ حضرت امام محمد عباسیؑ کی اپنی تحریک بالکل خفیہ تھی اور آل علی کے ناکہ نہاد شیعہ کی فتنہ ساز مانیوں کے سبب انھیں اس میں شریک کرنے کی غلطی وہ نہیں کر سکتے تھے۔ دعوت کے اجراء کے بعد تو ایسے کسی اہلاس میں شرکت کا سوال ہی نہ تھا جیسا کہ مذکور ہوا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ ایسا کوئی اہلاس منعقد ہی نہیں ہوا۔ بنو ہاشم خلافت قائمہ کے وفادار تھے اور جنہوں نے

بغاوت کی اکھیں خود اپنے گھر والوں کی بھی حمایت حاصل نہ ہوئی یہ جانیکے
امت ان کی طرت جھکتی۔ چند سیائیوں کے علاوہ اکھیں اپنے حمایتی نہ مل سکے
اور سیائی وہ تھے جو یوں تو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے اور عقیدت کا اظہار
کرتے تھے مگر عین وقت پر بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔

یعقوبی نے روایت اس انداز میں لکھی ہے کہ جیسے عبداللہ المنصور
عباسی اور محمد الارقط حسنی پختگی عمر کو پہنچ چکے ہوں کہ بنو ہاشم کا ایسا ایلا
منعقد ہو تو اس میں ان کی شخصیتیں نمایا ہوں۔ حالانکہ ان دونوں کی
عمر تو اس وقت اتنی ہوئی جب خلافت عباسیہ قائم ہو چکی تھی۔ تو پھر اس کا
امکان کہاں تھا کہ محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کی صدارت میں ایلا ہو
اور ابو جعفر المنصور عباسی اس میں ایک عام فرد خاندان کی حیثیت سے
جا بیٹھیں۔ یعنی اپنے ہی خلافت ریشہ دو انیاں کرتے وہاں پہنچ جائیں۔

امام ابو حنیفہ اور ابراہیم حسنی
ادبہ بیان ہوا کہ راویوں کے
بقول محمد الارقط حسنی اور ان کے

بھائی ابراہیم نے مدینے اور بصرے میں بیک وقت خروج کا منصوبہ بنایا
تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ ابراہیم حسنی چونکہ اچانک بیمار پڑ گئے اس لئے وقت
موجود پر کھڑے نہ ہو سکے اور یوں ایک ساتھ دو محاذ کھول دینے کا موقعہ
جاتا رہا۔ بہر حال ابراہیم نے بعد میں خروج کیا۔ اب سوال ہے کہ منصوبہ تو
آتا بڑا بتایا گیا تھا کہ حکومت قائمہ کا تختہ قوچی طاقت سے الٹ دیا جائے۔
مگر محض ایک شخص کے بیمار پڑ جانے سے خروج ملتوی کر دیا گیا۔ اگر واقعی تیاری
مکمل تھی۔ سامان حرب فراہم تھا۔ خفیہ قوچ تیار کر لی گئی تھی، تمام تفصیلات
طے تھیں۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ مدینہ طیبہ اور بصرے کے درمیان کتنا فاصلہ ہے

یعنی دونوں شہروں میں رابطہ قائم کرنے اور قوری پیغام رسانی کے وسائل موجود رکھنے تو پھر وقت موجود ہے خروج کیوں نہیں کیا گیا۔ کیا ابراہیم حسنی کے علاوہ کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو اس "فوج" کی قیادت کر سکے؟ یہ عجیب بات ہے کہ منصوبہ تو بنایا جائے انقلاب لائے گا لیکن یہ "فوج" تیار کی جائے اس میں کوئی قابل اعتماد آدمی نہ ہو یا پھر یہ منصوبہ خود اپنے آدمیوں سے بھی پوشیدہ رکھا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بعد کی وضع کردہ باتیں ہیں۔ نہ یہ دونوں خروج کسی منصوبے کے تحت تھے اور نہ ان کے لئے کوئی مؤثر تیاری کی گئی تھی معمولی غور و فکر سے وہ سب داستانیں پیچ ثابت ہوتی ہیں جو ان دونوں خروجوں کو اہمیت دینے کے لئے بیان کی گئی ہیں۔ سوائے عظیم شخصی طالع آزمائی کی ان دونوں خروجوں کو کچھ اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد الارقط وغیرہ کی یہ ایک عظیم الشان تحریک تھی اور دعوت عباسیہ ہی کی طرح عالم گیر۔ یعنی ان کے داعی بھی دنیا بھر میں عباسی داعیوں کے متوازی کام کر رہے تھے۔ لیکن اس خیالی منظر کشی کی نمود کسی جگہ اور کسی موقع پر نظر نہیں آتی۔ محمد الارقط ہوں یا ان کے بھائی ابراہیم یا اور کوئی علوی، ان میں ہر ایک کا خروج بغیر کسی تنظیم کے ہوا۔ اور بغیر کسی حکم اور تعمیری نصیب العین کے ہوا۔ اسی وجہ سے ان میں سے کسی کو اتنے مددگار نہ مل سکے جو واقعی کسی درجے میں انقلاب لاسکیں اور مرکز پر ان کا قبضہ ہو سکے۔

خلافت عباسیہ کے انحطاط کے وقت دور و دراز علاقوں میں بعض علویوں کا قبضہ بے شک ہو گیا لیکن اکثر و بیشتر وہ بھی عارضی ثابت ہوا۔ ابراہیم نے خروج بصرے میں کیا تھا اور کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ

نئی زیر دست جماعت تھی کہ امیر المؤمنین المنصور پریشان ہو گئے اور انہوں نے یہ خیالی گھوڑے تو دوڑا دیے۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ معمولی جھڑپ میں ابراہیم شکست کھا گئے اور سب قصہ تمام ہوا۔

پھر کوئی سلیم العقل شخص کیا یہ یا ور کر سکتا ہے کہ ایک خاص منصوبے کے تحت خلافت عباسیہ کا تختہ الٹنے کے لئے یہ دونوں بھائی تیار کیا کر رہے تھے، سامان حرب جمع کیا جا رہا تھا اور فوجوں کی تنظیم ہو رہی تھی لیکن نہ مدینے میں کوئی بے چینی تھی اور نہ بصرے میں دونوں شہروں کے والی خواب خرگوش میں محو تھے۔ اور انھیں خبر نہ تھی کہ ان کے شہروں میں کن عزائم کے تحت کیا کام ہو رہا ہے۔ امیر المؤمنین کے فرمان کے مطابق کوفے اور بصرے سے اور دنیا جہان سے دار الخلافہ کی تعمیر کے لئے کارکن جمع کئے جا رہے تھے اور سب کام اطمینان سے ہو رہا تھا۔ مگر نہ امیر بصرہ کو خبر تھی کہ ان کے شہر میں ہزاروں افراد نے ابراہیم کی فوج میں نام لکھا دیا اور سعیت توڑ کر خروج کی تیاریاں کر رہے ہیں اور نہ امیر المؤمنین ہی کے جاسوس کوئی اطلاع آپ تک پہنچانے تھے۔ اگر بصرے میں کوئی بے چینی ہوتی تو جیسے ایک فوجی دستہ مدینہ طیبہ بھی گیا تھا۔ ایسا ہی کچھ انتظام بصرے کے لئے بھی ہوتا تاکہ فتنہ سر اٹھاتے ہی ختم کر دیا جائے۔ یعنی ایک زیر دست انقلابی تحریک کی موجودگی میں امیر المؤمنین کی توجہ اس تحریک کو پکڑنے پر مرکوز ہوتی نہ کہ دار الخلافہ کی تعمیر پر۔ یہ کام نہایت امن و امان کے زمانے میں ہوتا ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ ان دونوں علویوں کا خروج نہایت حقیر اور وقتی ہنگامہ تھا جو فرو ہو گیا۔ اور ایسا ہنگامہ ایک عظیم الشان حکومت کے رقبے میں

کہیں نہ کہیں ہوتا ہی رہتا ہے۔

ایسا دیکھنا ہے کہ امام اعظمؒ حاضر ہیں یا رگاہ خلافت میں اور اہم کی انجام دہی میں مشغول، لیکن فتویٰ جاری کر رہے ہیں ابراہیم کے خرد کی حمایت میں یعنی نہ کتاب و سنت کی پروا ہے اور نہ خود اپنے اور اپنے مشائخ کے کھلے ہوئے مذہب کی۔ اس کے بعد سوال ہے امام صاحب اس خیالی فتوے کو اتنی شہرت کیوں دی جا رہی ہے۔ بقول ان مؤلفین کے جب "ابتار رسول اللہ" ایک دینی اور ملی تقاضا پورا کرتے کھڑے ہو تو انھیں ایک عجیب عالم کے فتوے کی کیا ضرورت تھی؟ دین تو بقول ان کے ان ہی کے گھر سے لکھلا کھانا نہ کہ بلاد عجم سے۔

وجہ یہ ہے کہ حضرت امام اعظمؒ کے شاگردوں نے تمام عالم اسلام میں حنفی مذہب رائج کیا اور امت کی بھاری اکثریت نے اس دین کی پیروی کی اسلئے بعد کے مسلمانوں کو علویوں کے خروج کی اہمیت اور حقانیت ثابت کرنے کے اس فرضی اور اختراعی فتویٰ کا سہارا لیا گیا، ورنہ مسلمان جو امام اعظمؒ تتبع ہیں وہ مذہب حنفی کے مطابق ایسے خرد و جوں کو صریح بغاوت اور ملت اسلامیہ سے غداری تصور کرتے ہیں۔ اس لئے انھیں دھوکہ دینے کے لئے یہ بات وضع کی گئی کہ امام صاحب نے ابراہیم کے حق میں فتویٰ دیا تھا، اس سبب نہ کہ حضرت امام اس وقت کہاں تھے کن فرانس کی بجا آوری میں مشغول تھے۔ اور ابراہیم سے ان کا رابطہ ہو بھی سکتا تھا یا نہیں۔ پھر یہ سوچا گیا کہ فتویٰ کی بات اس وقت تک ورنہ نہیں ہو سکتی تھی جب تک امام کے قید ہونے اور ان پر کورے پڑنے کی داستانیں بیان نہ جائیں، اس لئے ان روایتوں کا تانا بانا بتایا گیا۔ لیکن اتنا پھر بھی حیا

میں کیا گیا کہ امام صاحب کی موجودہ عظمت و شان تو دنیائے اسلام میں ان کے
شاگردوں کے سبب قائم ہوئی۔ جیہوں نے اپنے امام کے آثار علمیہ اور فقہی
راہ کو کتابی شکل دے کر اہل عالم کو اس عظیم شخصیت کے افکار سے روشناس
کیا۔ ورنہ ۱۲۵۰ھ میں ان کی حیثیت ایسی نمایاں کہاں تھی کہ امیر المؤمنین
امت میں ان کی مقبولیت کا رعب پڑے۔ وہ بھی ہزار ہا علماء کی طرح ایک
بڑے عالم تھے۔ مجتہد مطلق اور مقتدرائے عالم تو انھیں بعد میں تسلیم کیا گیا، امام
یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔ را البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶) المعلماء اربعۃ
لثوری والوحنیفہ و مالک والاوزاعی ر عالم چار ہیں سفیان ثوری
یوحنیفہ، مالک، اوزاعی، ان میں سے دو کے شاگرد اتنے بڑے تھے
کہ اہل عالم میں وہی مشہور ہوئے اور ان کے افکار دنیا میں پھیلے یعنی امام ^{فقط}
یوحنیفہ اور امام مالک۔ امام اوزاعی کے افکار بھی امام عظیم کے شاگردوں
ہی کے طفیل سے مشہور ہیں۔ مگر کتابوں کی ہمت تک، عامۃ المسلمین تو ان کے
نام بھی نہیں جانتے۔ حالانکہ اپنے علم و فضل میں وہ ان دونوں بزرگواروں
سے کچھ کم نہ تھے۔ غرض یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں جو عظمت امام عظیم کی
تسلیم کی جاتی ہے وہ اس وقت انھیں حاصل نہ تھی۔

امیر المؤمنین المنصور نے جس طرح محمد الارقط حسنی اور ان کے بھائی
ابراہیم کی بغاوتوں کا قصہ پاک کیا اور ان کے دوسرے چند عزیزوں کو جرم
بغاوت کی اعانت میں قید و بند کی سزا دی، اسی طرح وہ امام صاحب کو بھی
شہادت کے درجے پر فائز کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ
نہ محمد و ابراہیم کی بغاوت فرو کرنے کے نتیجے میں امت کے اندر کوئی ہیجان پیدا
ہوا اور نہ دوسرے "ابناء رسول اللہ" کے قید ہوتے پر۔ کیونکہ ہم عصر امت صریح

حال جانتی تھی۔ اسی طرح امام صاحب کے قید کئے جانے، کوڑے لگائے جانے اور زہر سے قید خانے میں ختم کئے جانے کی داستانوں کے باوجود کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ اہل بغداد نے یا دنیا، اسلام کے کسی دوسرے گوشے میں مسلمانوں نے امام عظیمؒ کی یابت کسی واقعی یا موہوم سانچے کا کوئی نہیں لیا ہو، امام صاحب کو علانیہ قتل کر دیا جاتا، تب بھی آل رسولؐ کے مقابلے میں انکی کیا اہمیت ہو؟ امام ابوحنیفہؒ کے متعلق یہ سب لغویاتیں بعد کے لوگوں کی تراشی ہوئی ہیں اور انکی وقائع یقین سو برس بعد اسوقت وضع کی گئیں جب سیاسی پروپیگنڈا اپنے عروج پر تھا اور حضرت امام کو امام مجتہد مطلق اور مقتداۃ عالم تسلیم کر لیا تھا تاکہ وہ مسلمان جو علویوں کے خروج اور انکو انجام پر لائے ہوئے اکھیل امام عظیمؒ اور امام مالکؒ پر خلافت قائمہ کے مظالم کی ذمہ داری داستانوں ہی سے متاثر کیا جائے۔ افسوس ہے کہ خطیب بغدادیؒ نے بے سوچے سمجھے یا امامؒ سے تعصب کے تحت یہ وضعی روایتیں اپنی کتاب تاریخ بغداد میں لکھ دیا ہیں۔ بعد کے لوگ ان خرافات کو ایسے لے اڑے کہ آج اسے حقیقت ثابتہ یا ورک جاتا ہے۔ تاریخ بغداد یا مناقب نعمانؒ کی کتابوں میں ان روایتوں سے نسبت آ نکھیں بتر کر رکھی ہیں جن سے صحیح احوال کا پتہ چلایا جاسکتا ہے اور واقعات ثابتہ کے مطابق ہیں۔ مگر جن کے دلوں میں بیماری ہے انھیں صاف اور دل کو لگتی روایات کے مقابلے میں وہ وہی روایتیں مرغوب ہیں جن کے ذریعہ خلفاء اسلام پر طعن کی گنجائش نکلے۔ کیونکہ ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اموی اور عباسی خلافتوں کی شرعی حجت پر حرج لاکر یہ ثابت کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور ان کا اتباع نے ان خلافت پر اجماع کر کے دین مبین کو غارت کر دیا تھا اور برعکس خویش ایک عظیم نقص اسلام کے قول کے مطابق اپنی قیادت یا اہمیت کے ہاتھ میں دیدہ

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ امام اعظمؒ کو یہ بھی قید کیا گیا، نہ ان پر کورے
 پائے گئے، نہ انھیں زہر دیا گیا اور نہ انھوں نے زید و محمد و ابراہیم کی حیات
 میں فتویٰ دیا اور نہ حسن بن محطیہ سے ان کی کبھی ایسی ملاقات ہوئی کہ وہ
 انھیں خلافت قائمہ سے برگشتہ کرنے کی کوشش کریں۔ وہ پوری طرح
 ائمہ المؤمنین المنصور کی بیعت پر قائم تھے اور قواعد شرعیہ کے مطابق ان
 نے مطیع و منقاد رہے۔ منصب خلافت کی عظمت ان کے دل میں تھی۔ اور
 ائمہ المؤمنین کی خدمات جلیلہ انجام دینا وہ اپنا دینی و ملی فریضہ جانتے تھے
 اسی لئے ان کے نقش قدم پر ان کے عظیم المرتبت شاگرد چلے۔ اور دنیا کو
 نور و حکمت سے بھر دیا۔

اگر امام اعظمؒ عیاذ اللہ خلافت قائمہ کے خلاف ہوتے اور یا نبیوں
 کے ہم نوا تو لازم تھا کہ امیر المؤمنین کی نگاہوں سے گری جائیں اور ان کے شاگرد
 کو بھی وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو ہوا۔ بلکہ یہ عظیم المرتبت ائمہ بھی اپنے شیخ
 امام کے مسلک کے خلاف حکومت قائمہ کے متا صیب قبول نہ کرتے اور یہ ایک
 یاسا اتفاقی سانحہ ہوتا کہ اس سے امت کا پورا استغناء تباہ ہو جاتا۔ اور
 یہ درخشانی ہرگز نہ آتی جس کی آب و تاب سے اہل عالم کی نگاہیں خیرہ ہیں
 محمد الارقط و ابراہیم کے خرد جوں میں امام اعظمؒ و امام مالکؒ کے موقف کی
 نقائی کے بعد ہم اب اس اقرار پر متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو امام ابو حنیفہؒ
 اور مکتیہ حنفیہ پر کیا گیا ہے۔ تدوین فقہ حنفیہ کے متعلق جو غلط بیابانیاں
 سوائے عالم کتاب "خلافت و ولایت" میں کی گئی ہیں اس کی تبیق و تردید
 تو پہلے بھی کتاب "حقیقت خلافت و ولایت" میں کی جا چکی ہے۔

امیر المؤمنین المنصور امام ابو حنیفہ اور مکتبہ حنفیہ

امیر المؤمنین ابو جعفر عبداللہ الامام المنصور بن محمد الامام بن علی بن عبد اللہ جبر اللامۃ بن عباسؓ عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک ثقافت اسلامیکہ ارتقار میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ اس امت کے عظیم ترین ائمہ میں ہیں، حدیث و فقہ و لغت و ادب میں ایسے بلند پایہ کے کہ اگر حلقہ درس قائم کرتے تو ان کے ہد بزرگوار سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کی یاد تازہ ہو جاتی، دور دور سے لوگ طلب علم کے لئے حاضر ہوتے، امام ابن کثیر فرماتے ہیں راہدایہ والہتایہ ج ۱۰ ص ۱۲۶

وکان المنصور فی شبیبۃ یطلب العلم من مظاہرہ والحديث والفقہ فنال جانبا جیداً وطرفاً صالحاً
اپنی جوانی میں المنصورؒ ہر صاحب کمال سے علم حاصل کیا نیز حدیث و فقہ اس طرح آپ کو رتبہ بلند اور درجہ قوی نصیب ہوا۔

محدثوں کا جو طریقہ تھا کہ طلب حدیث کے لئے دور دور کا سفر کرتے تھے ایک شہر کے علماء سے فیض اٹھا کر دوسرے شہر کا رخ کرتے تھے ایسے سفر کا رَحَلۃ کہتے ہیں۔ امام المنصورؒ کی رَحَلۃ کا یہی عالم تھا۔ مشرق کا شاید ہی کوئی اہم شہر ایسا چھوڑا ہو جہاں طلب علم کے لئے نہ پہنچے ہوں، ابن قلد نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے (ص ۸) طبع مصر وقد کان ابو جعفر بمکان من العلم قریباً لخلافتہ وبعد ہا را امیر المؤمنین ابو جعفر علی اور دینی اعتبار سے خلافت سے پہلے بھی بلند رتبہ تھے اور بعد میں بھی

ان امور خلافت میں اہٹھاک سے آپ کے علم کی تازگی اور زہد و تقویٰ کی
فیت ماند نہیں پڑی تھی۔ ہم عصر شمار تے آپ کی علمی شان اور زہنی عظمت
عزرات کیا ہے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ اور یہ آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا
نتیجہ تھا کہ علوم و فنون کی تدوین اور نشر و اشاعت کا وہ سلسلہ شروع
ہو جس نے امت مسلمہ کو اہل عالم کے لئے نمونہ بنایا، اور دلوں میں اس کی
روی کی لگن پیدا کر دی۔

رکت علمی اموی عہد مبارک میں متمدن دنیا کا بہت بڑا رقبہ خلافت
اسلامیہ کے تحت آچکا تھا۔ تین براعظموں میں امت
بل چکی تھی اور ایسے مختلف النوع عناصر، ملت میں داخل ہو گئے تھے
بن مبین کو خالص شکل میں محفوظ و مدون کرنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا، چنانچہ
فت عباسیہ کے قیام کے ساتھ ہی امیر المؤمنین المنصورؒ نے یہ محسوس
کیا کہ اب فتوحات کی بجائے وقت اس کا آگیا کہ ثقافت اسلامیہ کے
فقط وار تقار کی بسیل نکالی جائے۔ تاکہ دین کے تمام کلیات و جزئیات
نی صورت میں مدون ہو جائیں اور خلافت کا ایسا آئین و دستور مرتب
یا جائے جو آئندہ کے لئے مشعل راہ ہو۔ مسلمان اس قابل ہو جائیں کہ اپنی
دل و قوا عد کے مطابق احوال حاضرہ کے ساتھ ساتھ چل سکیں یعنی انسانی
فا کے نتیجے میں جو مسائل سامنے آتے جائیں ان کا حل دریافت کر کے کی
رت و صلاحیت رکھیں، غیر عرب عناصر کے قوت پکڑ لینے سے اس اقدام کی
ورت اور بھی واضح ہو گئی تاکہ ثقافتوں کے تصادم کا نتیجہ تخریبی نہ ہونے
نے اور کسر و انکار کا انجام تعمیری رہے۔

یوں حکومت کے استحکام کے بعد، دار الخلافہ کی تعمیر سے بھی پہلے اپنے

بڑے بڑے علماء عصر کو اس طرت متویہ کیا اور ۱۲۳۱ھ میں قرابین نافذ کیا
چنانچہ امام ذہبی فرماتے ہیں تاریخ الخلفاء طبع مصر

۱۲۳۳ھ میں اس زمانہ کے علماء

نے حدیث و فقہ اور تفسیر کی تدوین شروع کی، چنانچہ ابن جریر نے مکہ میں

تصنیف کی اور امام مالک نے مدینہ

طیبہ میں موطاء لکھی۔ امام ابو

نعمان نے شام میں، ابن ابی عروہ اور

ابن سلمہ وغیرہ نے یمن میں،

معمر نے یمن میں، سفیان ثوری

کوثر میں، کتابیں لکھیں اور امام

ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فقہ اور

مدون کی۔ پھر کچھ دن بعد شیم نے

ابن ابی نعیم نے اور پھر ابن المبارک

ابو یوسف نے اور ابن وریق کتابیں

یوں علم کی تدوین ترتیب کی کثرت سے

عربیت، لغت، تاریخ اور احوال

پر کتابیں لکھی گئیں۔ اس سے پہلے

انہما یا تو اپنے حلقہ سے تعلیم

کرتے تھے، یا ایسے صحیح نوشتہ

سے جو غیر

فی سنة ثلاث و اربعین

شرع علماء الاسلام فی هذا

العصر تدوین الحدیث و

الفقه والتفسیر فصنف

ابن جریر بحکمۃ مالک

الموطاء یا مدینۃ و الاوزاعی

بالشام و ابن ابی عروہ و

حماد بن سلمۃ و غیرہما

بالبصرۃ، و معمر و سفیان

الثوری بالكوفۃ، و صنف

ابن اسحاق المغازی و صنف

ابو حنیفۃ رحمہ اللہ الفقہ

و الزائی

ثم بعد یسیر صنف

ہشیم، و اللیث و ابن جلیعہ

ثم ابن المبارک و ابو یوسف

و ابن وہب و کثر تدوین

العلم و تیویہ و دققت

کتب العربیۃ و اللغۃ و

مرتب تھے۔

التاریخ وایام الناس قبل هذا
العصر کان الائمة یتکلمون
محققہم اویرون العلم من
صحف صحیحة غیر مرتبة

اموی عہد میں اس کی ضرورت نہ تھی کہ تحریری کام ہو کیونکہ وہ زمانہ صحابہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جو تمام عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے اور ہر جگہ
ان کا فیض جاری تھا، اور ان کے صحبت یافتہ حضرات ان کے علوم کی اشاعت
کر رہے تھے۔ جگہ جگہ علماء و فقہاء کے حلقہائے درس قائم تھے اور اہل عرب
کے طرز پر تمام تدریس زبانی ہوتی تھی۔ یعنی علم سیتہ بسینہ چلتا تھا مسلمانوں
کی زیادہ توجہ جہاد فی سبیل اللہ پر تھی۔ وہ جدہ سرخ کرتے تھے ان کی فطری
تعلیمات کی سادگی اور ان کے کردار کی رفعت دلوں کو موہ لیتی تھی۔ فقہی
موثقہ گائیوں کی بجائے مدار سادگی عمل پر تھا۔ اموی خلیفہ عمر الثانی نے
اگرچہ علماء وقت کو تصنیف و تالیف پر متوجہ کیا تھا۔ اور بعض رسائل اور
نوشے مرتب بھی ہو گئے تھے، لیکن یہ کام ابتدائی تھا۔ اور نوشتوں کی نوعیت
ایسی نہ تھی کہ انہیں مدون اور مسبوظ تصنیفات کا درجہ دیا جائے جیسا کہ
امام ذہبی نے وضاحت فرمادی ہے۔ ویسے تحریری کام آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے حضور ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ آپ نے متعدد فرامین و ذریعہ
مسائل پر رسالے مختلف مقامات پر بھیجوائے تھے اور سیدنا عبداللہ بن عمر
بن العاص رضی اللہ عنہما نے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ چنانچہ
صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ بیان محفوظ ہے (رج ص ۲ طبع مصر
ما من اصحاب لنبی صلی اللہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے

عليه السلام احد اكثر حديثا
عنه مني الا ما كان من عباد الله
بن عمر فان كان يكتب ولا
اكتب

کوئی صاحب آپ کی احادیث بیان کرنے
میں مجھ سے زیادہ نہیں سوائے عبد اللہ
ابن عمر و ابن العاص کے کیونکہ وہ لکھ
کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

لیکن آخر عہد اموی تک علماء و فقہاء کا عام طریقہ کاری یہی تھا کہ حفظ سے
درس دیا کرتے تھے۔ شاگرد جو سنتے اسے دماغوں میں محفوظ رکھتے تھے اگر کسی نے کچھ
لکھا بھی تو حفظ کرتے کے لئے۔ چنانچہ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں نام لکھ
کا یہ قول نقل کیا ہے: "لم يكن القوم يكتبون انما كانوا يحفظون
من كتب منهم شيئا فانما يكتبه ليحفظه فاذا حفظه حواه
واوگ لکھا نہیں کرتے تھے بلکہ صرف یاد کیا کرتے تھے اور اگر ان میں سے کسی نے کچھ
لکھا تو یہ تحریر شخص حفظ کرنے کے لئے ہوتی تھی۔ جب وہ حفظ کر لیتا تو مٹا دیتا۔
یہ عرب کا فاضل تھا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں حفظ کی خاص صفت سے
توازا تھا۔ ایک دفعہ کی بات سنی ہوئی ان کے دماغوں میں محفوظ رہتی تھی۔
اسی لئے وہ اپنی قوت حافظہ قائم رکھنے کے لئے کتابت سے گریز کرتے تھے، اور
یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جو شخص ظاہر پر تکیہ کرتا ہے اس کی باطنی قوت گھٹ
جاتی ہے۔ ابن عبد البر نے ان علماء کے اقوال نقل کر کے جو کتابت پسند نہیں
کرتے تھے لکھا ہے۔

من ذكرنا قوله في هذا الباب
فانما ذهب في ذلك مذهب
العرب لانهم كانوا مطبوعين
على الحفظ لخصوص صيتهم

اس موضوع پر جس جس کا قول ہم نے
دیہرایا ہے تو ان کا طریقہ وہی تھا جو
عربوں کا ہوتا ہے وہ فطری طور پر
یاد رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور

الذین کرہوا الكتاب کابن
عباس، والشعبي وابن شهاب
النفی وقبادة ومن ذهب
لذهابهم وجبل جبلتهم
لأنوا قد طبعوا علی الحفظ

یہ ان کی خصوصیت ہے جو حضرات
لکھائی پستہ نہیں کرتے جیسے حضرت ابن
عباس، امام شعبی، امام ابراہیم النخعی اور
حضرت قتادہ اور وہ سب لوگ جن کا
یہی طریقہ تھا اور ایسی ہی ذہنیت تھی
انہیں طبعی طور پر حفظ کرنے کا ملکہ تھا۔

چنانچہ امام شعبی فرماتے ہیں ”ما کنیت سواداً فی بیاض ولا استعدت
عدیثاً من انسان (میں نے کوئی بات کاغذ پر نہیں لکھی اور نہ کسی شخص سے اپنی
ت دوبارہ کہنے کو کہا) حضرت ابن عباسؓ نے عمرو بن ربیعہ کا قصیدہ ایک
نوع میں کراہی طرح سنا دیا تھا، یہ تھا عرب کا حال، اور وہ ماحول جیت تک
انہم رہا۔ غیر عرب بھی اسی طرز پر چلے لیکن خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد صورت
ال بدل گئی۔ اور معاشرے کا تقاضا یہی ہوا کہ اب فقط پر مدار نہیں ہو سکتا
ورنہ ایک منظم اور آئینی حکومت اس طرح چل سکتی ہے کہ اس کا قانون کتابی
صورت میں مدون نہ ہو۔

اس بارے میں امیر المؤمنین المتصور کی لگن اور عزیمت کا یہ عالم تھا کہ
راہین بھیجنے کے علاوہ اکابر میں سے بعض کو بالمشافہ گفتار کے لئے طلب فرمایا

امیر المؤمنین المامونؑ کا حلقہ بھی عجوبہ روزگار تھا۔ عبد اللہ بن ادریس کی خدمت میں حاضر
وئے جو امام اعظمؒ کے اکابر تلامذہ میں ہیں۔ انہوں نے سو حدیثیں بیان کیں بعد میں امامون
نے عرض کیا عم محترم اجازت ہو تو یہ احادیث سناؤں۔ ابن ادریس نے فرمایا سناؤ تو انھوں
نے من وعن سب سنا دیں۔ ابن ادریس دنگ رہ گئے۔ یہ زمانہ مامون کی ولایت عہد
اور غالب علمی کا تھا (تذکرۃ الحفاظ)

جیسے امام اعظمؒ اور امام اوزاعیؒ کو۔ چونکہ امام مالکؒ کسی طرح مدینہ طیبہ سے باہر جانے پر تیار نہیں تھے۔ اس لئے ان کے پاس خود جا کر گفتگو کی۔ اس وقت عالم اسلام میں تین فقہی مکتب تھے، حجازی، عراقی اور شامی اور ہر مکتبے میں استخراج مسائل کے لئے، مجمدہ منقولات کے مقامی "عرف" کا بھی کا طریقہ جاتا تھا۔

عرف فقہی امور میں کتاب و سنت کے صریح احکام کے علاوہ عرف بھی ایک دلیل شرعی ہے۔ یعنی معاشرات اور معاملات میں مقامی رسم و رواج کے مطابق طریقہ کار ہر دستور جو احکام شرعیہ کے خلاف نہ ہو اور اس میں لوگوں کے لئے آسانی نظر آئے اور عمومی منفعت معلوم ہو اسے باقی رکھا جاتا ہے۔ دعوت محمدیہ کا منشا یہ نہیں ہے کہ اقوام عالم کے ثقافتی اور تہذیبی شعائر و رسوم کو منسوخ و مردود قرار دے، وہ تو ایک ارتقائی تحریک ہے، اور عظیم ترین، جو تمام نوع انسانی پر اتمام نعمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے جاری کی اسی مسلمانوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ قوموں کا ثقافتی سرمایہ محفوظ کریں اور علوم و فنون کو ترقی دیں اور ان کے تمام امور کو عربی قالب دیکر ارتقائی انداز میں سب کا مشترک سرمایہ حیات بنادیں، یعنی ان کے اختلافات کی تبدیل کردہ وجہ استلذات پیدا کریں۔ اسی لئے فقہاء کے ہاں عرف کی بڑی اہمیت ہے۔ علاقے کی اپنی خصوصیات اور ہر ملک کے اپنے دستور ہوتے ہیں، سیاست و معاملات، قوانین مملکت اور آداب نظم و نسق وغیرہ امور سے وہاں کے لوگوں انس ہوتا ہے اور مناسبت ہوتی ہے۔ اب فقہاء کا کام ہے کہ اقوام عالم کے تجربے سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور جو امور کتاب و سنت کے صریح احکام سے متعارض نہ ہوں انہیں باقی رہنے دیں اور جہاں تعارض ہو وہاں ان کی اصلاح کی۔

قواعد دینیہ کے تحت لے آئیں۔

جیسا کہ مذکور ہوا اس وقت عالم اسلام میں تین فقہی مکتب تھے ایک فقہ حجاز جس کے علمبرار امام مالکؒ تھے یہاں کا عرف سنی تھا اور عموماً صحابہ کرام کے قیامی حوال پر مبنی۔ دوسرا مکتب فقہی عراق کا تھا جس کی نمایندگی امام عظیمؒ کرتے تھے۔ یہاں کی معاشرت و ماحول میں بحیثیت کا امتزاج تھا، تیسرا مکتب فقہ شام کا تھا جس کے مرجع امام اوزاعیؒ تھے۔ یہاں کی معاشرت اور آداب معشت میں رومی تمدن کا امتزاج تھا، گویا ان تین مکتبہائے فقہ کے ذریعہ حجاز و عراق شام کے عرف مستند قرار پائے اور یوں عرف کو عالم گیری ملی اور آئندہ کے لئے بھی طے ہوا کہ مسلمان جہاں جائیں وہاں کے عرف کی افادیت دیکھ کر اپنے اصول و قواعد کے تحت لے آئیں۔ اس طرح ثقافت اسلامیہ کا ارتقاء ہوا۔

ثقافت عجمیہ کے قیام میں بلاد عجم کی تائید کو زیادہ دخل تھا، اس لئے امیر المؤمنین المنصورؒ کی توجہ امام ابوحنیفہؒ کے طریقہ استدلال اور طرز امتیاز پر مرکوز ہو گئی، آپ نے امام صاحب کی یہ حیثیت پہچانی کہ انھیں اپنے حضور طلب کریں اور ان کے ذریعہ ایک وسیع تر فقہی مکتبہ کی بنیاد رکھیں جو تمام عالم اسلام میں مقبول ہو سکے۔ اسی لئے امام عظیمؒ کو اپنے پاس رکھا۔ پھر آپ ہی کے فاضل شاگردوں کو ثقافت عجمیہ میں اعلیٰ ترین مناصب پر فائز کیا گیا۔

امیر المؤمنین المنصورؒ کو اس کا خاص اہتمام تھا کہ جس شخص کے سپرد جو ام کریں اس کے بارے میں تحقیق کر لیں کہ اپنے فقہی اصول میں وہ صحابہ کرامؓ کے منہاج سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ یہ غلط اطلاع آپ کو ملی تھی کہ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں رقیاس پر ہے اور وہ حدیث پر اسے مقدم رکھتے ہیں اس لئے اس بارے میں ان سے وضاحت طلب کی امام صاحب کا یہ جواب شیخ ابو زہرہؒ نے اپنی

اپنی کتاب ابو حنیفہ میں بھی نقل کیا ہے (ص ۲۷۰)

یروی ان ایا جعفر المتصور
کتب الیہ بلغنی انک تقدم
القياس على الحديث فرد عليه
ابو حنیفہ یرسالة جاء قیرها
ولیس الامر کما بلغک یا
امیر المؤمنین انما اعمل اولاً
بکتاب الله ثم بسنة رسول
الله صلی الله علیه وسلم
ثم باقضية ابي یکر و عمر
عثمان و علی رضی الله عنهم
ثم باقضية یقية الصحابة
ثم اقیس بعد ذلك اذا
اختلفوا۔

روایت ہے کہ امیر المؤمنین (ابو حنیفہ)
المنصور نے انھیں لکھا "مجھے معلوم
ہوا ہے کہ آپ، قیاس کو حدیث
مقدم رکھتے ہیں" تو امام ابو حنیفہ نے
انھیں مراسلہ بھیجا جس میں لکھا۔
امیر المؤمنین بات وہ نہیں ہے
آپ کو پہنچی میں اول کتاب اللہ پر
کرتا ہوں پھر سنت رسول اللہ صلی
علیہ وسلم پر پھر حضرت ابوبکر و عمر
عثمان و علی رضی اللہ عنہم
کے فیصلوں پر پھر باقی صحابہ کرام
پر اس کے بعد جب ان میں اختلاف
پاتا ہوں تو قیاس کرتا ہوں۔

امیر المؤمنین المنصور کو سنت کی حفاظت کا اتنا اہتمام تھا کہ اس بارے
تمام امور کی نگرانی آپ خود فرماتے اور ہدایات دیدیتے تھے جیسا کہ تدوین آثار
کے سلسلے میں امام مالک کو اپنے فرمان بھیجا تھا جو ہم دوسری جگہ نقل کر
ہیں یعنی محمد بن عیسیٰ بن عبد اللہ حسنی کے خروج کے سلسلے میں، امیر المؤمنین
موصوف کی اسی سچی مشکور کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اس طرح امیر المؤمنین (المنصور)
نے بغداد میں علمی ادبی زندگی کی

و لکن الاسس المتصور الحیوة
علمیة ادبیة فی بغداد و

کات اول ما انشاءها مدارس
الطب والعلوم الدينية لنفق
في سبيلها اموال طائلة

اور سب سے پہلے آپ نے وہاں طبی
اور دینی علوم کی درسگاہیں قائم کیں
اور اس راہ میں بذریعہ روپیہ خرچ کیا۔

یہی بات کتاب المعارف کے مقدمہ نویس "ثروة عكاشة" نے لکھی کہ عیسیٰ
خلفاء کس طرح علوم و فنون کی تدوین اور نشر و اشاعت پر حریص تھے وہ
وہ کہتے ہیں۔

كانوا من الخلقاء العلماء فزغوا
في العلم واحسنوا وقادة اهل
وشجعوهم عليه وانتعشت
بغداد بمن فيها ومن وفد اليها و
اصبحت ميدان الحركة العلمية
فكرية واسعة

یہ خلفاء چونکہ علماء تھے اس لئے انھوں
نے تحصیل علم پر لوگوں کو متوجہ کیا
اہل علم کی قدردانی کی اور اس پر اتنی
ہمت بندھائی، اس طرح بغداد
علمی اور ثقافتی حیثیت سے پروان
چڑھا، اور خوران کے لئے جو وہاں

رہتے ہوں اور ان کیلئے بھی جو باہر سے وہاں آئیں، فکری علمی حرکت کیلئے ایک وسیع
میدان بن گیا۔

امام ذہبیؒ نے اپنے بیان میں یہ تصریح نہیں کی کہ ۱۲۳ھ سے تصنیف و
تالیف کا جو کام شروع کیا گیا وہ امیر المؤمنین المنصورؒ کے فرامین کی پزیرائی
میں تھا، لیکن یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے، ورنہ سب جگہ ایک ہی سال
سے کام کیوں شروع ہوتا۔ حجت تک مرکز کی طرف سے سب کو یہ یک وقت ہدایت
نہ پہنچتی۔ اس زمانہ میں رسل و رسائل کے وسائل ایسے نہ تھے کہ ایک کام
سن کر دوسرا بھی اسی وقت شروع کر دے۔

علاوہ ازیں چند حضرات کے اسماء گرامی یہاں نقل کئے جاتے ہیں جن کے

میں پنج برس جو آپ کے اساتذہ کرام اور ہم عصر علماء کا تھا۔ یعنی تقریر پر مدار تھا
 ورتا اگر دسب ارشادات اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے تھے۔ اگر کسی نے کچھ لکھا
 بھی تو یاد کرنے کے لئے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ عیاں ہی عہد میں بھی سلسلہ
 تک آیتیں ہی طریقہ قائم رکھا۔

لیکن جب سلسلہ میں آیتیں کتابی صورت میں اپنا علم مدون کرنا
 پایا۔ اور اس کیلئے خاکہ مرتب کیا تو دو برس بعد آپ کو بغداد طلب کر لیا گیا اور
 آخری پانچ برس آپ کے وہیں گزرے۔ ان پانچ برسوں میں آپ کے متعلق
 میں کام تھے۔ ایک دارالخلافت کی تعمیر کی نگرانی، دوسرے یہ کہ بارگاہ خلافت
 میں امیر المؤمنین کی فقہی آراء معلوم کرنے کے لئے دیار و امصار سے جو استفتاء
 آئیں ان کے مناسب جواب دینا۔ اور تیسرے یہ کہ خلافت اسلامیہ کی دفاعی
 امور پر منضبط و مدون کتاب مرتب کرنا۔ گویا امام صاحب کی زندگی کے یہ
 آخری پانچ سال انتہائی مشغولیت کے گزرے چنانچہ خود الملکی نے اپنی
 متضاد روایات کے انبار میں یہ سچی بات بھی لکھ دی (مناقب النعمان ج ۱ ص ۱۸۰)
 ان اباجعفر کان ثقیلاً یا حنیفة
 من الکوفة الی بغداد و جلسہ
 عند نفسه و اسراد علی القضا
 غیر مرة فاعتذر و استعفی
 و احتال لیکل حیلۃ فی رفق
 و مداراة حتی عفا عنه و امر
 بالاقامة علی یابہ حتی یجری
 علیہ ما ورن من المسائل و

امیر المؤمنین ابو جعفر نے امام ابو حنیفہ
 کو کوفہ سے بغداد بلایا تھا اور اپنے ہی
 پاس انھیں ٹھہرایا۔ کئی مرتبہ انھوں
 قاضی بنانا چاہا مگر وہ ترقی اور ادب کے
 ساتھ قسم قسم کے حیلوں سے اس منصب
 سے معاف رکھے جانے کے خواستگار ہو
 تا آنکہ انھوں نے انھیں معاف رکھا
 مگر حکم دیا کہ بارگاہ میں حاضر رہیں۔

القضایا من الامصار فینظر
فیہا ویامر ما یجب بہ ان
یؤمر۔ فلم یزل مقیما عند
بغداد لایأذن لہ فی
الانصراف الی الکوفۃ
حتی مات بہا۔

تاکہ مختلف شہروں سے جو عمل طلب کیا
اور معاملات آئیں ان پر نگاہ ڈالی
اور مناسب احکام صادر کریں جو
انہی کی خدمت میں وہ مستقل طور
بغداد رہے، آپ انہیں کوٹے والے
ہوتے کی اجازت نہیں دیتے تھے تا
وہیں انہوں نے ربیعہ حضرت امام نے
وفات پائی۔

ایک سیدھی سادی بات کو ان صاحب نے ہیر پھیر سے بیان کیا ہے کہ
گویا یہ حیر تھا، حالانکہ بیان پر امیر المؤمنین کے بغایت اعتماد کے سبب تھا
اس خاص اہم دینی ضرورت کے لئے وہ امام اعظم کو موز و ترین شخص سمجھتے تھے
کیونکہ خود امیر المؤمنین کو اپنے ملکی مسائل کے سبب اس طرف توجہ کی فرصت نہ

یہ عہدہ قضا قبول کرنا آسان کام نہیں اسی لئے ہمارے بہت ائمہ قاضی بننے سے گریز کرتے
و آدمیوں کے مابین فیصلہ کرنا اتنا سخت کام ہے کہ حسب روایت احمد و ابی داؤد
و ترمذی و ابن ماجہ من جعل قاضیا بین الناس فقد ذبح بغير سكين
شخص کو لوگوں کے مابین قاضی بنایا گیا تو گویا اسے چھری کے بغیر ذبح کر دیا گیا
و قانع تاریخی میں ہمارے بعض ائمہ کا قاضی بننے سے انکار اسی خوف و خشیت
کی بنا پر تھا نہ کہ اس لئے جو ہوا پرست لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ حکومت سے
تعارف کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور جنہیں اپنے اوپر عمارت کا کھوں نے یہ عہدہ قبول
کیا ورنہ ہمارا عدلیہ اہل عالم کے لئے نمونہ کیسے بنتا۔

۳۔ تحریری کام حضرت امام کے سب سے چھوٹے شاگرد امام محمد بن

حسنؒ آپ کے قیام بغداد کے زمانے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں
آپ نے امور دین و دنیا پر اپنی دونوں کتابیں سیر کی المار کرائیں۔ حکومت اسلامیہ کیلئے
ایسی ایک منضبط تالیف کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ سلطان الملک المعظمؒ نے

اسہم المصیب میں بیان کیا ہے (ص ۶۶ طبع دیوبند)

راہم (ابو حنیفہؒ نے) راہم (امام) محمدؒ کو

سیر کی دونوں کتابیں المار کرائیں ان

دونوں میں آپ نے جہاد کے مسائل بتائے

اور امر اور نہی کے وہ فرق جو چہرے پر انکو

لئے ضروری ہوتا ہے نیز وہ باتیں

جو سرحدی علاقوں کے لوگوں پر واجب

ہیں اور غنیمتوں کی تقسیم کے طریقے

بتائے اس انداز میں کہ نہ ان سے پہلے

کسی نے اس طرح جمع کئے تھے اور نہ انکو

بعد کوئی اس طرح جمع کر سکا۔

امام محمدؒ امام اعظمؒ کے سب سے چھوٹے شاگرد ہیں آپ کے بعد انھوں نے

بقیہ علوم کی تکمیل امام ابو یوسفؒ اور امام اوزاعیؒ۔ امام مالکؒ سے کی۔ امام

محمدؒ کی پیدائش ۱۳۵ھ کی ہے یعنی تعمیر بغداد کے وقت ۱۳۵ھ میں آپ

دس برس کے تھے۔ امام اعظمؒ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی اور اس وقت شہر

کی تفصیل تیار ہو چکی تھی۔ اگر بارہ چودہ برس کی عمر میں امام محمدؒ نے یہ دونوں

کتابیں اپنے شیخ کی المار سے لکھیں تو یہ بات ۱۴۰ھ سے ۱۵۰ھ کے درمیان

فان اباحنیفۃ رضی اللہ تعالیٰ

عنه امی محمد ارحمہ اللہ تعالیٰ

کتابی السیر و ذکر فیہا من امور

الجہاد و وصایا الاءراء و ما

یبتغی لہم فعلہ و ما یبتغی

ان یفعلہ اهل التقویٰ و قسمة

الغنائم و المریبۃ الی

احد و لم یجمع مثله بعد

احد

کی ہوگی۔ اس زمانہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے بارہ چودہ برس ہی کی عمر کافی ہوا کرتی تھی اور سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں بھی تعلیم مکمل ہو جاتی تھی۔

کتاب الاشارة

ظاہر ہے کہ جب ۱۲۱۳ھ میں فقہ اسلامی کو قید کتاب میں لانے کا کام شروع ہوا، تو اس کے لئے بنیادی طریقہ ہی تھا کہ ارشادات نبویہ اور آثار صحابہ کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا جائے اور پھر مسائل کا استخراج ہو۔ چنانچہ امام عظیمؒ نے اسی کی طرح ڈالی۔ سیوطی کا بیان ہے رتبیض الصحیفة فی مناقب ابی حنیفة (من مناقب ابی حنیفة التي انفرد بها اول من دون علم الشريعة ومرتبة ابوايا ثم تبعه مالك بن النس في ترتيب المؤطاء ولم يسبق ايا حنیفة احد۔)

ابو حنیفہ کے مناقب میں یہ اچھوتی بات ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے علم شریعت مدون کیا اور فقہی مسائل کے مطابق اس کے باب متعین کئے پھر انہی کی پیروی میں مؤطاء کی ترتیب مالک بن انس نے کی۔ یہ کام ابو حنیفہ سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔

سیوطی کا یہ بیان محل نظر ہے۔ جب سب نے ایک ہی سال کام شروع کیا اور ایک دوسرے سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر رہتے تھے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ایک نے دوسرے کی پیروی کی۔ امیر المؤمنین المنصورؒ نے امام مالکؒ کو جس انداز کا فرمان بھیجا تھا۔ اس کا یہ قدرتی تقاضا تھا کہ وہ آثار کو فقہی ابواب پر مرتب فرمائیں۔ اور جو بھی ذہین شخص فقہ کی کتابی تدوین کرے گا اسے لازماً سب سے پہلے احادیث کو فقہی ابواب پر مرتب کرنا ہوگا۔ امام عظیمؒ کا یہ ذہن رسا تھا کہ یہی طریقہ آپ نے اختیار کیا۔ اور عجب نہیں کہ خود امیر المؤمنین

موصوف نے انھیں بھی ایسی ہدایت کھنچی ہو جیسی امام مالکؒ کو کھنچی۔ قیاس کو حدیث پر مقدم نہ رکھنے کی ہدایت میں ایسے ایک فرمان کا اشارہ ملتا ہے اگرچہ تاریخ میں مذکور نہیں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں خود بخود آجاتی ہے کہ سیکڑوں میں کے فاصلے پر رہتے والے دو ایک آدمی بیک وقت کام شروع کریں اور ان دونوں کا طریقہ ایک ہی ہو، یہ تو ہو نہیں سکتا جب تک دونوں کو اوپر سے یکساں ہدایات بیک وقت نہ ملی ہوں۔

امام صاحب کی کتابیں امام صاحب کو تحریری کام کرنے کے لئے کوئی میں صرف دو برس ملے، اس لئے آپ نے کتاب الآثار کا خاکہ ہی مرتب کیا ہو گا۔ بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو مغالطہ سیوطی کو لگا اسے بیخ کر دکھائیں اور یہ یاد رکھنا چاہیں کہ کتاب الآثار امام عظیمؒ کی زندگی ہی میں اور خود انہی کی کے ہاتھوں کتابی صورت اختیار کر چکی تھی۔ حالانکہ یہ تصور قابل قبول نہیں۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ کتاب السیر ہو یا کتاب الآثار یا امام صاحب کی طرف منسوب کوئی دوسری کتاب ہو ان میں سے کسی ایک کو مدون کتاب کی صورت ان کی زندگی میں نہیں دی جاسکتی تھی۔ تدوین و تالیف و تصنیف کا سب کام آپ کے بعد آپ کے عظیم المرتبت شاگردوں کے ہاتھوں انجام پایا اور اس وقت جب وہ خلافت اسلامیہ کے اہم مناصب پر فائز ہو، الملک المعظم رحمہ اللہ نے کتاب السیر کی جو توصیف کی ہے یا سیوطی نے کتاب الآثار کی، یہ دراصل تعریف و توصیف امام محمدؒ کی سعی مشکور کی ہے جیسا کہ ہم آگے تصریح کریں گے۔ یہاں ہم ایک اور مغالطے پر متوجہ کرتے ہیں۔ امام طحاویؒ نے بسند متصل اسدین فرات کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

کان اصحابی بحقیقۃ الذین
دَوُّوا الکتب الاربعین رجلاً
وکان فی العشرۃ المتقدمین
ابو یوسف، زفر، وداؤد الدانی
واسد بن عمر، و یوسف بن
خالد السمّتی، و یحیی بن زکریا
بن ابی زائده و هو الذی
کان یکتبہا لہم ثلاثین سنۃ

ابو حنیفہؒ کے وہ اصحاب جنہوں نے کتابیں
مدون کیں چالیس حضرات تھے ان میں
اولین درجہ جن دس کا ہے ان میں
ابو یوسف، زفر، داؤد البطانی، ابن
عمر، یوسف بن خالد السمّتی، یحیی بن
زکریا بن ابی زائده اور یحیی بن زکریا
ان کتابوں کو ان کے لئے تیس برس
تک لکھتے رہے۔

اس بیان میں کئی حضرات کے اسماء گرامی رد گئے ہیں مثلاً عبد اللہ بن ابی اسحاق
رم ۱۸۱ھ امام حفص بن غیاث رم ۱۸۵ھ اور امام وکیع بن اکبراج ۱۹۸ھ
جو امام شافعی اور امام احمدؒ کے استاد ہیں علامہ شبلیؒ نے مذکورہ بالا روایت
نقل کر کے اعتراض کیا ہے کہ یحیی بن زکریا جو ۱۸۲ھ میں پیدا ہوئے وہ
۱۸۵ھ تک جو امام اعظم کا سال وفات ہے یہ کام تیس برس کیسے انجام دے
سکتے تھے، علامہ شبلیؒ جیسے ذرا نہ شخص کو یہ مغالطہ کیوں ہوا اور اس روایت
سے اکھنوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ یہ سب تحریری کام ان حضرات نے امام اعظمؒ کے
حضور انجام دیا تھا۔ یہاں تو بیان یہ کیا گیا ہے کہ امام صاحب کے اصحاب میں
جن حضرات نے تالیف و تصنیف کا کام کیا وہ یہ ہیں۔ ہمارے زمانے کے
بزرگم خود ایک بڑے مفکر اسلامؒ صاحب نے بھی امت کو یہی مغالطہ دینے کی
کوشش کی ہے کہ امام صاحب نے ایک غیر سرکاری مجلس قانون سازی بنائی
تھی۔ اور تیس برس کے اندر اکھنوں نے قانون اسلام مدون کر کے رکھ دیا
جو پچاس برس کے اندر خلافت عباسیہ میں سرکاری حیثیت حاصل کر گیا ایک

بدھی بات کو اس طرح کج کر کے غلط تاثر دینے کی کوشش کی گئی۔ روایت میں کہاں ہے کہ امام صاحب کے سلسلے بیٹھ کر یہ حضرات آپ کے ارشادات مدو یا کرتے تھے۔ بیان تو صرف اتنا ہے کہ امام عظیمؒ کے اجداد تلامذہ جموں نے فقہ ملام پر کتابیں لکھیں وہ یہ حضرات تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سیکام امام صاحب وفات کے بعد ہوا اور پھر کچھ استبعاد نہیں رہتا کہ یحییٰ بن زکریا نے بتیں اس تک ان حضرات کی خدمت میں حاضر رہ کر تصنیف و تالیف میں کتابت فرمائی، ان کا ہاتھ بٹایا ہو۔ امام صاحب کی طرف منسوب کتابوں کے کئی نسخے ہیں۔ ان میں امام صاحب کے علاوہ دوسرے بزرگواروں کی اقوال و روایات مذکور ہونا، اور روایات کی کمی بیشی خود دلیل ہے کہ یہ تصانیف بعد کی ہیں کتاب الآثار کے نسخوں میں امام زقرؒ امام ابو یوسف امام محمد امام سن ابن زیاد لو لوی کے نسخے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر بزرگوار نے اپنے حفظ اپنے درک اور اپنے فقہی رجحان کے مطابق امام عظیمؒ کی مرویات مدون فرمائی ہیں۔ اس طرح یہ تصانیف ان بزرگواروں کی ہیں نہ کہ امام صاحب کی۔ ان میں سب سے اہم امام محمدؒ کی کتاب الآثار ہے۔ اسی طرح سیر کی دونوں کتابیں جو امام عظیمؒ نے، امام محمدؒ کو بغداد میں املا کرائیں تھیں۔ ان کی تالیف امام محمدؒ نے اپنی تمام تصانیف کے بعد کی اور یہ امر متفق علیہ ہے۔ گویا وہ ہیں تو امام صاحب کے املا پر بنی مگر انھیں کسی حیثیت سے امام صاحب کی تصنیف نہیں کہا جاسکتا۔ وہ امام محمدؒ ہی کی تصنیف کردہ تسلیم کی جائیں گی۔

امام محمدؒ کی شان یہ ہے کہ کتاب الآثار کی طرح انہوں نے امام مالکؒ سے الموطا کی بھی روایت کی ہے اور اس کا یا قاعدہ درس دیتے تھے لیکن اس

کتاب کو مؤطا را امام مالکؒ بروایت امام محمدؒ نہیں کہا جاتا۔ بلکہ مؤطا را امام محمدؒ کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں محقق امام مالکؒ اپنی ہی مرویات نہیں ہیں بلکہ امام اعظمؒ کا مذہب بھی برابر بیان کیا ہے اور اگر اپنے مذہب کے مطابقت امام مالکؒ کی کوئی روایت معمولی یہاں نہ ہو تو حنفی زاد یہ نگاہ سے اس کی دل دیتے ہیں۔ یہی حال کتاب الآثار کا ہے کہ اس میں امام اعظمؒ کے علاوہ دو شیوخ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے یعنی صحیح بات یہ ہے کہ دونوں کتابیں امام اعظمؒ یا امام مالکؒ کی مرویات پر مبنی خود امام محمدؒ کی اپنی فقہ کی کتابیں ہیں۔ اسی لئے ان کی نسبت اپنی ہی طرف ہے اور ہونی بھی چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ مؤطا را امام مالکؒ اس کتاب کو کہتے ہیں جو یحییٰ المصمویؒ کی روایت پر مبنی امت میں متداول ہے اور اس میں امام مالکؒ کے علاوہ کسی دوسرے کی روایت نہیں۔

یوں اہل تحقیق کا قول بالکل صحیح ہے۔ امام اعظمؒ کی اپنی کوئی تصنیف دنیا میں نہیں۔ آپ کی فقہی آراء اور آپ کی روایت کردہ احادیث سب متروکین آپ کے شاگردوں نے اس وقت کی جب وہ خلافت عباسیہ اہم کارکن بن چکے تھے۔

فقہ حنفی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ وہ مقلد نہیں تھے۔ بلکہ مجتہد مطلق تھے۔ یہ ادربات ہے کہ ان کا بنی علم چونکہ امام اعظمؒ کے قیوس پر مبنی تھا۔ اس لئے لازماً اس کا رنگ حنفی رہا لیکن انھوں نے جگہ جگہ اپنے شیخ سے اختلاف بھی کیا ہے، کیونکہ ان کے پیش نظر کوئی خاص مکتبہ نہ تھا بلکہ وہ عالم گیر فقہی نظام مرتب کر رہے تھے امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے۔

الدین والفقه والعلم انتشر
في الامة عن اصحاب ابن
مسعود، واصحاب زيد بن
ثابت، واصحاب عبد الله بن
عمر، واصحاب عبد الله بن
عباس. فعلم الناس عامته
عن اصحاب هؤلاء الاربعة
فاما اهل المدينة فعلمهم
عن اصحاب زيد بن ثابت
وعبد الله بن عمر، واما اهل
مكة فعلمهم عن اصحاب
عبد الله بن عباس واما
اهل لعراق فعلمهم عن
اصحاب عبد الله بن مسعود

دین اور فقہ اور علم اس امت میں اصحاب
ابن مسعود، اصحاب زید بن ثابت، اصحاب
عبد اللہ بن عمر اور اصحاب عبد اللہ بن عباس
کے ذریعہ پھیلا۔ عام طور پر لوگوں کا علم
انہی چاروں کے اصحاب کے فیوض پر
بنی ہے، اہل مدینہ کو علم حضرت زید بن
ثابت اور حضرت عبد اللہ بن عمر کے اصحاب
سے ملا۔ اہل مکہ کو علم حضرت عبد اللہ بن
عباس کے اصحاب سے ملا، اور اہل عراق کو
علم حضرت عبد اللہ بن مسعود کے اصحاب
سے ملا

پچھلے صفحے میں گزر چکا کہ علماء کوفہ اور حضرت ابن مسعود کے تلامذہ نے
ان اصحاب سے بھی پورا قبض لیا جو کوفہ میں تشریف لائے اور پھر یہ حضرات
مدینہ طیبہ بھی حاضر ہوئے رہتے تھے۔ تاکہ حضرت امیر المؤمنین عمر الفاروق لا ینفک
اور حضرت ام المؤمنین عائشہ الصدیقہ الکبریٰ سے بھی اکتساب علم کریں۔ اسی طرح
امام اعظم نے اپنے کوئی اساتذہ کے علاوہ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس کے
کے خاص شاگرد حضرت عطاء بن ابی رباح سے بھی استفادہ کیا۔ علاوہ انہی
قاضی شریح رحمہ اللہ کے سلسلے سے آپ کو امام اہل الراۃ سیدنا معاذ بن جبل

سے بھی نہیں پہنچا

اپنے امام اور شیخ کے اسی منہاج پر ان کے شاگرد بھی چلے چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے امام اوزاعیؒ سے فقہ شام پر عبور حاصل کیا اور امام محمدؒ نے امام ابو یوسفؒ کے علاوہ حضرت امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ سے پورا پورا فیض لیا عرفین یہ ہے کہ عرت عام میں جسے فقہ حنفی کہا جاتا ہے وہ دراصل فقہ حجاز فقہ شام اور فقہ عراق پر مبنی اسلام کا اولین فقہی نظام ہے جو امام عظیمؒ کے تلامذہ نے اپنے امام کے طریقے پر رد و ن کیا، مقلدانہ نہیں بلکہ مجتہدانہ اسی لئے امت میں فقہ حنفی سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اور چونکہ یہ عظیم الشان کام خلفاء عباسیہ کی امامت میں انجام دیا گیا اس لئے تمام عالم اسلام کا مقبول ترین فقہی نظام قرار پایا۔

یہ ہے امیر المؤمنین عبداللہ المنصور عباسی کا وہ کارنامہ جس کے سبب یہ امت ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اور قیامت تک حقیقی فہما و علماء و صلحا اور عوام اس فقہ پر عمل کریں گے ان کے اعمال کے ثمرات و انوار سے امیر المؤمنین موصوف کے درجات بلند تر ہوتے چلے جائیں گے۔
عن سنن حسنہ حسنة قلنا انجزها واجزم من عمل بھار جس نے کسی نیک کام کی نہاد رکھی اسے اس کا ثواب ملیگا اور ان لوگوں کا ثواب بھی جو اس پر عمل پیرا ہوں۔

مودودی صاحب جیسے لوگوں نے جہاں یہ خلاف واقعہ بات کہی ہے کہ فقہ حنفی کی تدوین خود امام عظیمؒ نے ایک غیر سرکاری مجلس آئین سازہ بنا کر اپنے شاگردوں کے تعاون سے اپنی زندگی ہی میں کر دی تھی وہاں انھوں نے یہ لغویات بھی کہی ہے کہ یہ فقہ اپنی پشت پر کسی سرکاری قوت کے بغیر امت میں

قبول ہو گئی۔ جو لوگ صحابہ کرامؓ کے اجماع سے منہ موڑ کر اپنے خود ساختہ اصول
 قواعد کے تحت اموی اور عثمائی خلافتوں کی حجیت پر حرف لاتا چاہتے ہیں
 در واقعات سے آنکھ بند کر کے یہ خیالی تضاد قائم کرنا چاہتے ہیں کہ خلفاء اسلام
 اور علماء و فقہاء امت کے مابین تعاون و احترام و یک جہتی کا فقدان تھا
 یہ دعوت محمدیہ کے فروغ اور ملت اسلامیہ کے ارتقاء کو غلط رنگ میں
 پیش کر کے یوں امت کے قلوب و اذہان کو اسلاف کرام کی طرہ سے مکر
 کرنے کی سعی نامشکور کی معصیت میں مبتلا رہیں، ان کی سمجھ میں اتنی بات
 میں آتی کہ کوئی تشریعی نظام اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک
 اس کے عملاً نافذ کئے جانے کی خاطر اس کی پشت پر سیاسی قوت نہ ہو اور وہ
 رت ایسی ہونی چاہئے کہ قوم اس پر صمیم قلب سے اعتماد کرتی ہو۔ قرآن
 مجید میں بھی احکام اسی وقت نازل ہوئے جب مدینہ طیبہ میں اسلامی
 حکومت قائم ہو گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نفاذ شریعت کی
 سیاسی طاقت حاصل ہوئی۔ جو سیاسی نظام قوم میں نامقبول ہوگا
 اور ملت اسلامیہ مجموعی حیثیت سے اس سیاسی نظام کو دل کی گہرائی سے
 بنیادی نظام نہیں سمجھے گی تو ناممکن ہے کہ اس حکومت کے جاری کردہ قوانین
 راہی طور پر رائج ہو سکیں جو نہی حکومت ہٹے گی اس کے قوانین بھی منسوخ
 ہو جائیں گے۔ پوری تاریخ انسانیت اس پر گواہ ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حکومتیں بدلیں اور قسم قسم کے سیاسی بدد
 سے بہ امت دوچار ہوئی۔ مگر وہ فقہی نظام جو امیر المؤمنین المنصور اور
 ان کے اخلاف کرام کی نگرانی اور سرپرستی میں مدون ہوا۔ وہ آج تک اسی طرح
 مقبول چلا آ رہا ہے۔ یہ کسی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اموی اور عباسی خلافتیں

ہم عصرا امت کے نزدیک صحیح معنی میں دعوت محمدیہ کی نمائندہ حکومتیں تھیں۔ اور امت ان کی اطاعت اور ان سے دلی وابستگی کو تقاضائے ایمان جانتی تھی۔ اسی لئے وہ تمام تخریکیں ناکام ہوئیں جو ان خلافتوں کی دینی اور آئینی حیثیت ختم کرنے کے لئے جاری کی گئیں۔ اور وہ سب افراد قتل کے گھاؤں میں کھڑے ہوئے۔ لوگ اپنے تخریبی عزائم کے تحت کچھ بھی کہتے رہیں۔ مگر تاریخی حقیقت یہی ہے کہ دین میں اپنے تمام کلیات و جزئیات کے ساتھ عہد عہد نظام خلافت ہی کے تحت علماء و فقہاء امت نے مدون کیا۔ اور یہ اسی باہمی تعاون، واعتماد و احترام کا نتیجہ تھا۔ جو حکومت قائمہ اور فقہاء امت کے مابین ہمیشہ قائم رہا۔

مکتبہ حنفیہ چونکہ ہمارے پیش نظر صرف امام ابوحنیفہؒ کے مواقع ہیں اور ان کے ذیل میں آپ کے تلامذہ کے، اس لئے دوسرے ائمہ کا اگر ذکر آگیا ہے یا آگے آئے۔ تو محض ضمتاً ہوگا۔ مسطورہ بال سے واضح ہو گیا ہوگا کہ۔

۱۔ امام ابوحنیفہؒ پوری طرح جماعت سے وابستہ تھے اور فرقہ وارانہ تصورات کی ان کے ہاں کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ وحدت امت پر قرار رکھنے کے لئے حکومت قائمہ سے اپنے تعلقات یگانگت پر ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ابوی اور عیسیٰ خلافتیں صحیح بنیاد پر قائم تھیں اور یہ ان کا ملی ذرہ تھا کہ امام جماعت پوری طرح وابستہ رہیں اور ان تمام حرکتوں سے اپنا دامن بچائے رکھیں جو وحدت امت بابت پاش پاش ہوتی ہو۔ اور امت کا کلمہ متفرق ہوتا نظر آئے۔

انکا یہ مذہب شروع سے تھا اور آخر تک رہا۔ یہی مذہب انھیں اپنے اساتذہ سے ملا تھا اور اسی کی تلقین انھوں نے اپنے تلامذہ کو کی۔ جس پر انھوں نے عمل کیا اور خلافت قائمہ کے دست دیا روئے۔

۲۔ حضرت امام عظیمؑ کے زمانے میں زید بن علی بن الحسنؑ وغیرہ نے اموی خلافت میں اور محمد الارقط بن عبداللہ حسنی وغیرہ نے عباسی خلافت میں جو خروج کیا۔ امام صاحب اور دوسرے ہم عصر المئمہ نے ان خروجوں اور بغاوتوں سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھا اور وہ سب روایتیں عقلاً و نقلاً باطل ہیں جو ہوا پرست لوگوں نے اس ضمن میں بیان کی ہیں۔

۳۔ حکومت قائمہ اموی ہو یا عباسی قوا و عدوینہ کے تحت تمام علماء و فقہاء عصر کا پورا احترام کرتی تھی۔ ایسی تمام روایات صدیوں بعد کے لوگوں کی خود ساختہ ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کوشش کی گئی ہے کہ خلفاء اور علماء کے مابین دوئی کھنی، اور وہ ایک دوسرے کے خلاف حریفانہ اور معاندانہ جذبات رکھتے تھے، یہ کرامت ان خلفاء کی ہے کہ ایسی روایت اپنا بطلان خود ثابت کر دیتی ہے۔

تلامذہ امام امام عظیم ابو حنیفہؑ نے جس طرح ہدایات رہبانہ اور فرمودات نبویہ کے مطابق خلیفہ عصر سے اپنے تعلقات یکجہت استوار رکھنا اور ان کی اطاعت کرنا اپنا فریضہ ملی جانا اسی طرح ان کی اجلہ تلامذہ کا طریقہ کار تھا۔ اور اسی یا بھی رابطہ و صفاء کی برکت تھی کہ امت مسلمہ نے اپنے ارتقائی منازل طے کئے۔

۱۔ امام زفرؑ امام صاحب کے سب سے بڑے شاگرد اور جانشین امام زفرؑ ہیں۔ جو امام صاحب کی زندگی میں بصرے کے قاضی مقرر ہوئے تھے اور اس

خدمت سے وہ اس وقت مستعفی ہوئے جب اپنی شیخ کی وفات پر انکی جائزہ
کی ذمہ داری ان پر آ پڑی۔ جس کے فرائض اکھنوں نے اپنی وفات تک
برس انجام دئے۔ ابن عبد البر نے الانتقاء میں ان کے قاضی بننے کی وجہ
رونداد نقل کی ہے را ابو زہرہ۔ ابو حنیفہ ص ۲۱۸

جب حکومت نے اکھنیں بصرے کا قاضی مقرر کیا یعنی امیر المؤمنین
المنصور نے تو امام ابو حنیفہؒ نے ان سے فرمایا ”ہمارے دارالحکومت
بصرہ کے مابین جو اختلافات ہیں اور وہ لوگ ہم سے حد کرتے
ہیں، اس کے پیش نظر مجھے امید نہیں کہ تم اپنے فرائض کامیابی
سے انجام دے سکو گے“ لیکن امام زفرؒ تو کلاً علی التدریج
لگے اور اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ بصری علماء ان کے پاس
آنے لگے اور مناظرے کا سلسلہ شروع ہو گیا جب امام
زفرؒ خا طب کو فقہی مسائل میں قائل کر لیتے تو فرماتے ”یہ ہے
ابو حنیفہ کا قول“ لوگ تعجب سے کہتے ”ابو حنیفہ کے علم میں
اتنی گہرائی ہے؟“ تو آپ فرماتے ہیں ”اس سے بھی زیادہ“

یوں رفتہ رفتہ وہ تعصب جاتا رہا۔ اب حکومت کے ساتھ تعاون
امیر المؤمنین موصوف کی فرماں برداری کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے۔
کہ امام زفرؒ نے اس علاقے کا قاضی بننا منظور کر لیا۔ جہاں کا ماحول ان کی خلافت
تھا۔ یعنی اکھنوں نے اسے اپنا دینی فریضہ جانا کہ حالات موافق ہوں یا
امیر المؤمنین کا فرمان بجالانا چاہئے۔

۲۔ امام ابو یوسفؒ کو امام زفرؒ کے بعد درجہ امام ابو یوسفؒ کا

امیر المؤمنین المہدی عباسیؒ نے آپ کو شرقی بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ پھر ہی

ان کے بعد امیر المؤمنین الہادیؑ کے زمانے میں رہا۔ امیر المؤمنین ہارون الرشیدؑ کے عہد زریں میں آپ کو قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ شیخ ابو زہرہ کہتے ہیں۔
 ر الوصیفہ ص ۱۹۶

ولقد ولی القضاء لثلاثة
 من الخلفاء للمهدي ثم للهادي
 ثم للرشيد يقول ابن عبد البر كان
 الرشيد يكرمه ويحله وكان عند
 خطيبا مكيئا۔

وہ تین خلفاء کی طرف سے قاضی رہے
 یعنی المہدیؑ، الہادیؑ اور الرشیدؑ
 ابن عبد البر کہتے ہیں کہ الرشیدؑ نے اس کی
 عزت و احترام کرتے تھے اور وہ آپ کے
 ہاں بہت مقید رہا اور جدا حلیہ پہنتا تھا۔

اس سے پہلے اسلام میں قاضی القضاۃ کا کوئی عہدہ نہ تھا اور یہ شرف
 امام ابو یوسفؒ کا ہے کہ آپ ہی سے پہلے قاضی القضاۃ بنے۔ اسی عہدے
 کی برکت تھی کہ تمام عالم اسلام میں امام اعظمؒ کے تلامذہ نے اسلام کا یہ
 فقہ حنفی کے مطابق منتظم کیا۔ کیونکہ صحابہ کرام سے لے کر اپنے شاگرد تک کے
 تمام فقہی مکتبہائے فکر سے اس کی تدوین میں پورا پورا استفادہ کیا گیا تھا۔
 اسی لئے ہر علاقے کے لوگوں نے خوش دلی کے ساتھ اس ایما کی فتنہ پرانی
 در آمد کر لیا۔ اسی دوران آپ نے وہ معرکہ الاراک کتاب لکھی جو آپ کی کتاب
 الخراج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تالیف امیر المؤمنین ہارون الرشیدؑ
 کی فرمائش پر تھی۔ اس کے مقدمے میں خود فرماتے ہیں۔

ان امیر المؤمنین ایدہ اللہ
 تعالیٰ ساء لى ان احتم کتابا
 جامعا۔

امیر المؤمنین نے، اللہ تعالیٰ ان کا
 حاجی و ناصر ہو، مجھ سے قرآن لکھنے
 کی ہے کہ میں ایک جامع کتاب لکھوں

گویا جس طرح امیر المؤمنین المنصورؒ کی قرآن لکھنے پر امام مالکؒ نے مروتا

شریف کی تدوین کی اور امام اعظمؒ نے سیر کی کتاب الملاء کرائی اسی طرح امیر المومنین
 ہارون الرشید کے فرمان کی پزیرائی میں امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج لکھی
 اسی عہد مبارک میں امام محمدؒ نے اپنی عظیم الشان کتابیں لکھیں۔ امام ابو یوسفؒ
 کی وفات ۱۸۲ھ میں ہوئی نام یعقوب تھا سلسلہ نسب یوں ہے۔
 یعقوب ابو یوسف بن ابراہیم بن حبیب بن سعد بن جنتہ بھلی امام ابو یوسفؒ
 کے فرزند یوسف اپنے والد راہد کی حیات ہی میں عہدہ قضا پر مقرر تھے۔
 ۳۔ امام محمدؒ۔ امام محمدؒ نے اپنے شیخ امام اعظمؒ کے بعد
 امام ابو یوسفؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ سے علوم کی تکمیل کی پھر امیر
 المومنین ہارون الرشید کے ایک قاضی مقرر ہوئے اور اسی منصب پر
 فائز ہونے کے بعد اپنی کتابیں لکھیں اور بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ عرف
 عام میں جسے فقہ حنفی کہتے ہیں اس کی تکمیل کا سہرا آپ کے سر ہے امام
 محمدؒ اور امام کافؒ نے ۱۸۹ھ میں ایک ہی دن وفات پائی امیر المومنین
 ہارون الرشیدؒ نے دونوں کی نماز جنازہ خود پڑھائی اور سرکاری اعداء
 کے ساتھ ان دونوں عظیم ہستیوں کی تدفین کے بعد حسرت سے فرمایا
 ”آج میرے ہاتھوں فقہ اور خود دونوں زیر زمین ہیں۔“ امام محمدؒ کی
 کنیت ابو عبد اللہ تھقی۔ شیبان سے نسب و لا کی بناء پر محمد الشیبانی کہلائے
 ۴۔ ابن المبارکؒ۔ امام اعظمؒ کے خاص شاگرد ہیں صاحب
 تصنیف ہونے کے علاوہ ایسے جامع الکملات تھے کہ رہتی دنیا تک یہ
 امت آپ پر فخر کرے گی۔ امیر المومنین ہارون الرشیدؒ کے ساتھ آپ کے
 تعلقات بہت گہرے تھے۔ ایک مرتبہ ۱۷۹ھ میں آپ نے طرطوس کے
 جہاد میں شرکت کی۔ جہاد بالقلم اور جہاد بالنفس سے آگے بڑھ کر حب اپنی

امام کی معیت میں جہاد یا سیف کیا اور اسکی عظمت و برکت اور انوار آپ پر
منکشف ہوئے تو اپنے اور امیر المؤمنین کے عزیز ترین دوست حضرت
فضیل بن عیاض کو حسب ذیل اشعار لکھ کر بھیجے را امام سبکی طبقات الشافعیۃ
الکبری ج ۱۱ ص ۱۵۱

يَا عَابِدَ الْحَرَمَيْنِ لَوِ ابْصَرْتَنَا
لَعَلِمْتَ أَنَّكَ فِي عِبَادَةِ تَلْعَبُ
اے حرمین میں عبادت کر نیوالے اگر آپ ہمیں دیکھتے تو جان لیتے کہ آپ کی عبادت ایک کھیل ہے
فَنَحْنُ دُرٌّ تَابِدٌ قَائِدُنَا نَحْضِبُ
اگر کوئی اپنے رخسار آنسوؤں سے رنگتا ہے۔ تو ہم اپنے خون سے اپنے گلے رنگتے ہیں
أَوْ كَانَ يُتَعَبُ حَيْلَةً فِي بَاطِلٍ
یا اپنے گھوڑوں کو فضول کاموں میں تھکانا ہو۔ تو ہمارے گھوڑے میدانِ کارزار
میں تھکائے جاتے ہیں۔

رَحِمَ السَّيَّابُ وَالْعَبَارُ الْوَطِيبُ
رَحِمَ الْعَبِيرُ لَكُمْ وَنَحْنُ مَعْبُورُنَا
تمہارے لئے خوشبو گلال کی ہے اور ہمارا گلال اڑتی ہوئی مٹی اور پاک غبار
وَلَقَدْ أَتَانَا عَنْ مَقَالٍ نَبِينَا
ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں یہ صحیح اور سچا قول پہنچا ہے جسے
جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

لَا كَيْسَتَوِي وَغَبَارُ حَيْلٍ لِّلَّهِ فِي
اَلْفِ أَهْرَاءٍ وَدُخَانُ تَارٍ لِّلْهَيْكَلِ
اللہ کی راہ میں گھوڑوں کا گھٹا ہوا غبار جو ایک آدمی کی ناک میں جائے اور
جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کا دھواں دونوں یک جہا نہیں ہو سکتے۔
هَذَا كِتَابُ اللَّهِ يَنْطِقُ بَيْنَنَا
لَيْسَ الشَّهِيدُ بِهَيْئَةٍ لَا يَكْذِبُ
یہ اللہ کی کتاب ہے جو فیصلہ سناتی ہے کہ شہید مڑتا نہیں اور یہ بات جھٹلاتی

نہیں جاسکتی۔

امیر المؤمنین موصوف کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ان کی وفات پر مجلس عزائم عقد کی، لوگ آکر امام ابن المبارکؒ کی وفات پر تعزیت پیش کرتے امام ابن المبارکؒ کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس میں آپؒ فرقہ بازوں کو عداوت و اعمال سے بیزاری ظاہر کر کے جماعت اور اس کے امام سے وابستگی کو ضروریات دین میں بتایا ہے اور یہ کہ خلافت ہی کے ذریعہ دین مبین کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ اس طویل قصیدے کے دو شعر یہ ہیں۔

اللَّهُ يَدْفَعُ بِالسُّلْطَانِ مُعْصِلَةً عَنْ دِينِنَا رَحْمَةً مِنْهُ وَرِضْوَانُهُ
الَّتِي تَعَالَى خَلِيفَةُ وَقْتُتِ كَيْدِ رَحْمَتِ أَوْرِضْنَا سَمَاءَ دِينِ كَيْدِ هَرِشْكَ

رفع فرماتا ہے۔

كَوْلَا الْأَكْحَاثُ كَمْ تَأْمَنُ لَنَا سُبُلٌ وَكَانَ أَصْعَقْنَا كُنْيًا لَا قُوَّةَ
اگر خلفاء اسلام نہ ہوتے تو ہمارے لئے ہمارے راستے محفوظ نہ رہ سکتے اور ہمارے کمزور لوگ ہمارے زبردستوں کا شکار بن جاتے۔

یعنی ہماری دینی اور دنیوی تمام ترقیاں، ملت کا تحفظ و ارتقاء اور ظاہری و باطنی فتنوں کے شر سے محفوظ رہنے کی سبیل نظام خلافت کے استحکام پر مبنی ہے۔

۵۔ قاسم بن معنؒ۔ یہ امام اعظمؒ کے اجداد تلامذہ میں ہیں حضرت ابن مسعودؓ کی اولاد میں تھے امام صاحب کی زندگی ہی میں امیر المؤمنین المنصورؒ کی طرف سے کوفے کے قاضی رہے۔ مگر منصب کی تنخواہ قبول نہیں کی اور رضا کارانہ فرائض انجام دئے۔ امام اعظمؒ ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے "انتم مسدود قلبی و جلاء حزنی رتم میرے دل کے سرور ہوا اور دوائے قلب حزین

تمام اصحاب السنن کے مشائخ میں ہیں بعض کے نزدیک ۱۷۵ھ میں وفات پائی اور بعض نے سال وفات ۱۵۵ھ بتایا ہے۔ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور صحیح سال وفات ۱۵۵ھ ہی ہے۔

۶۔ حماد بن ابی حنیفہ: امام اعظم کے یہ فرزند جلیل قاسم بن معن کے بعد کوئے کے قاضی ہوئے (رم ۱۷۵ھ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ)۔
 ۷۔ اسماعیل بن حماد: امام صاحب کے یہ پوتے اول مشرقی بغداد کے قاضی رہے اور پھر بصرے اور رقی کے (رم ۲۱۲ھ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ)

۸۔ حفص بن غیاث: یہ امام اعظم کے تلامذہ ہیں، سفیان ثوری اور یوسف سے بھی استفادہ کیا۔ ان سے جن حضرات نے استفادہ کیا، ان میں امام احمد امام یحییٰ بن معین، امام علی المدینی جیسے بزرگوار ہیں امیر المؤمنین ہارون الرشید کے عہد مبارک میں کوئے کے قاضی تھے۔ (رم ۱۹۴ھ)

۹۔ حسن بن زیاد لوؤی: یہ امام اعظم کے شاگرد ہیں کچھ دن کوئے کے قاضی رہے۔ پھر مستعفی ہو گئے (رم ۲۰۷ھ)۔
 ۱۰۔ امام اسد بن عمرو: یہ بھی امام اعظم کے اجلۃ تلامذہ ہیں ان کے متعلق امام ذہبی فرماتے ہیں۔ صاحب ایا حنیفہ و تفقہ علیہ من اهل الکوفہ، فقد ام بعد اد و تولی قضاء الشرقیہ راہل کوئے میں سے اکھنوں نے بھی ابو حنیفہ کی صحبت اختیار کی اور فقہ پر عبور حاصل کیا پھر بغداد آئے اور مشرقی بغداد کے قاضی بنے (بغداد امیر المؤمنین ہارون الرشید)۔
 ۱۱۔ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

اصحاب امام مالکؒ

ظفار کرام کے ساتھ امام اعظمؒ کے بارہی روابط

اور بیان ہوئے۔ ان کے عظیم المرتبت تلامذہ کا

خلافت عباسیہ کے اہم متاصب پرفائز ہو کر فقہ اسلامی کی تدوین کرنا بھی ہو چکا۔ اسی طرح امام مالکؒ اور ظفار عباسیہ کے گہرے روابط کا حال بھی لکھا جا چکا۔ اب ہم یہاں صرف چند مالکی حضرات کے اسماء گرامی لکھتے ہیں۔

۱۔ ابو مصعب زھری احمد بن ابی العوفی المذنیؒ۔ امام مالکؒ کے خاص شاگرد ہیں۔ امام نسائی کے علاوہ صحاح کے تمام مصنفوں کو آپ سے بلا واسطہ فیض ہے۔ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۰ھ میں وفات پائی مدینہ طیبہ کے قاضی تھے۔ امام ذہبی ان کے متعلق فرماتے ہیں۔ احدا لا یثاب و شیخ اهل المدینة وقاضیهم و محدثهم۔ مسلم الثبوت حفا میں ہیں۔ اہل مدینہ کے استاد تھے ان کے قاضی تھے ادران کے رئیس بڑے محدث تھے۔

۲۔ حارث بن سکینؒ۔ امام مالکؒ کے شاگرد، امیر المؤمنین المتوکل علی اللہ کے عہد میں مصر کے عہدہ قضا پر فائز تھے۔

۳۔ عبد اللہ بن الحکمؒ۔ یہ بھی امام مالکؒ کے شاگرد ہیں مصر میں انتظامیہ کے اہم عہدے پر تھے۔ یحییٰ امیر المؤمنین المتوکل علی اللہ

۴۔ امام شافعیؒ۔ آپ مجتہد مطلق ہیں۔ امام مالکؒ کی شاگرد امام اعظمؒ کے تلمیذ خاص اور وکیع بن الجراح کے بھی۔ امام محمدؒ سے آپ نے

بہت استفادہ کیا ہے۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں (مناقب ابی حنیفہؒ ص ۱۱۱) اما الشافعیؒ فاحیہ محمد بن الحسن فی الحدیث را امام شافعی

حدیث کے بارے میں امام محمدؒ کی روایات کو حجت سمجھتے ہیں خطیب بغدادی

تے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے (تاریخ بغداد، ج ۲ ص ۱۷۶) اَمَّنَ النَّاسُ
عَلَىٰ فِي الْفَقْهِ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ (مختصین فی الفقه میں محمد پر سب سے
زیادہ احسان محمد بن الحسن کا ہے) عاقط سمعانی نے بلوغ الامانی میں لکھا
یہ قول نقل کیا ہے۔ اَعَانَنِي اللَّهُ بِرُجُلَيْنِ يَابْنَ عَيْنِيهِ فِي الْحَدِيثِ
وَمُحَمَّدُ فِي الْفَقْهِ وَاللَّهُ تَعَالَىٰ تَعَالَىٰ تَعَالَىٰ تَعَالَىٰ تَعَالَىٰ تَعَالَىٰ تَعَالَىٰ
میں ابن عیینہ کے ذریعہ اور فقہ میں محمد کے ذریعہ)

امیر المؤمنین ہارون الرشیدؒ کے قاضیوں میں امام شافعیؒ بھی ہیں
اور آپ کے شاگردوں اور ان کے شاگردوں کے سلسلے کے سکڑوں حضرات
صدیوں تک خلافت عباسیہ کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اگر ان
سب کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک مجلد ہو۔ امیر المؤمنین المتوکل علی
اللہؒ کو آپ سے خاص عقیدت تھی اور اتنی کہ بعض لوگ انھیں شافعی المذہب
کہتے ہیں جو صحیح نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک خلفاء کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے
البتہ امیر المؤمنین القادرؒ بالشر شافعی المذہب تھے اور شوارف کے صاحب
تصنیف اکثر ہیں (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۳ ص ۱۱) اسی
طرح امیر المؤمنین المسترشدؒ بالشر بھی شافعی المذہب تھے۔ نیز بعض مؤرخین
خلفاء۔ امیر المؤمنین المستنصرؒ بالشر اور امیر المؤمنین الناصر الدینؒ بالشر
مذہبی تھے۔

امام احمدؒ۔ آپ بھی مجتہد مطلق ہیں۔ امام ابو یوسفؒ اور امام ربیع
ابن یزیدؒ سے رشتہ تلمذ تھا۔ امام ذہبیؒ نے مناقب میں آپ کا یہ بیان نقل
کیا ہے۔ اول ما كتبت الحديث اختلفت الى ابي يوسف القضاة
وكثرت عنه ثم اختلفت بعد الى الناس (سب سے پہلے میں نے جو احادیث

لکھیں تو ان کے لئے قاضی ابویوسف کی قدمت میں حاضر ہوتا رہا اور ان سے
 احادیث نقل کیں پھر دوسرے حضرات کے پاس گیا۔ اسی طرح امام محمدؒ اور
 امام شافعیؒ سے آپ نے اکتساب فیض کیا ہے۔ امیر المؤمنین المعتصم باللہؒ
 سے خلق قرآن کے سلسلے میں آپ کا اختلاف ہوا تھا۔ اور اس سلسلے میں
 لوگوں نے روایات کا ایک اینار لگا دیا ہے جن پر تنقید سے فی احوال نہیں غرض
 نہیں۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ اس اختلاف کے بعد آپ سات برس امیر المؤمنین
 المتوکل علی اللہؒ کے عہد میں زندہ رہے اور اپنے مذہب کی تلقین کی اور وہ
 مذہب وہ نہیں تھا جو لوگوں نے آپ کی طرف منسوب کر دیا ہے، آپ کا مذہب
 یہ تھا کہ کلامی مسائل میں گفتگو بے ضرورت ہے اور بدعت یعنی آپ کے
 نزدیک قرآن مجید کو غیر مخلوق کہنا بھی بدعت تھا اور مخلوق کہنا بھی، آپ
 اس اعتقاد کو کافی وشافی بتاتے تھے کہ قرآن کلام اللہ ہے اور بس۔ یہ
 موضوع بھی طویل ہے اور ہمارے ائمہ نے اس پر کافی بحث کی ہے اور
 ان لوگوں کا قول غلط بتایا ہے جو کہتے ہیں کہ امام احمدؒ قرآن مجید کو غیر مخلوق
 کہتے تھے اور کہنے والے کو کافر مانتے تھے۔ ملاحظہ ہو "طبقات الشافعیہ"
 البکری ج ۵، ص ۸۰ بذیل مادہ امام عزیٰ الدین عبد العزیز بن عبد السلام
 قدس سرہ۔ فرماتے ہیں۔ واحمد بن حنبل وفضلاء اصحابہ و
 سائر علماء السلف برأوا الى الله مما نسبوه اليهم واختلفوه
 عليهم را احمد بن حنبل اور ان کے فاضل اصحاب اور تمام علماء سلف اس
 چیز سے بری ہیں جو لوگوں نے ان کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ اور ان پر
 بہتان باندھے ہیں۔

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ امیر المؤمنین المتوکل علی اللہؒ سے امام احمدؒ

فلقات بہت خصوصی تھے اور اکثر امور میں وہ آپ کی رائے لئے بغیر کوئی حکم
 نہیں کرتے تھے۔ آپ ہی کی رائے کے مطابق امیر المؤمنین موصوف نے کربلا
 صنوعی قبریں جو عرضہ دراز کے بعد الکل پچوینائی گئی تھیں وہاں کی بدعات
 شرکانہ رسوم کی بنیاد پر منہدم کرادی تھیں۔ اسی مذہب کے مطابق سلطان
 سعود نے حرمین شریفین کی قبریں سہار کرادیں یہی مذہب امیر المؤمنین
 کا تھا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اور یہی مذہب سیدنا عمر بن العاص کا تھا
 نے وصیت فرمائی تھی کہ آپ کی قبر مبارک پر نرم کتکریاں ڈال دیجائیں
 رفتہ رفتہ قبر معدوم ہو جائے۔ دنیا دارا بقنا ہے یہاں ثبات کی کوشش
 ہی لا حاصل ہی رہے گی۔

نگارائے مذہب امام اعظمؒ ان کے تلامذہ اور پھر ان کے وہ تلامذہ جو خود صاحب
 مذہب اور خود مجتہد مطلق ہیں ان کے اور خلافت قائمہ کے
 بین روابط اور باہم تعاون و احترام کا یہ مختصر تبصرہ یوں تو بالکل کافی ہے
 اس کا بین ثبوت کہ خلافت قائمہ اور امامت مذہب کے مابین دوئی نہ تھی
 امام المسلمین کی قیادت میں امت کا وھدانی نظام تھا جس کے تحت ہر
 من اپنی جگہ اپنے دائرہ عمل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت
 کی آبیاری میں مصروف رہتا تھا اور وحدت امت کا تصور دل سے محو نہیں
 ہونے دیتا تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجموعی حیثیت سے کبھی سب باطل فرقے
 نئی حیثیت نہ بنا سکے کہ عددی اعتبار سے امت کے سوا داعظم کے حریف
 ہو سکیں۔

اب ہم حیدر اور اکابر امت کا ذکر تازہ کرتے ہیں۔ جنہوں نے نظام
 خلافت کی دینی حیثیت اور خلفاء اسلام سے روابط کا استحکام ایک فریقہ

ملیہ جانا۔

۱۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ: مشاہیر اولیاء اللہ میں ہر اکابر عباد اور اعلا تعلیم زیادہ میں آپ کا شمار ہے۔ اہل حدیث کے ہاں آپ کی ثقہ ثبوت امام زرقاہ اور قابل استناد امام کہا جاتا ہے۔ آپ امیر المؤمنین ہارون الرشیدؒ کے خاص احباب میں گئے اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ حج کے موقع پر آپ نے امیر المؤمنین کو تشریف لائے دیکھا تو عبدالرزاق سے فرمایا رتایرخ الخلفاء میں ۲۸ طبع مصر قال عبدالرزاق کنت مع الفضیل بمکہ فمیت ہارون فقال فضیل الناس یکرہون ہذا وما فی الامر عزا عت علی منہ۔

عبدالرزاق سے یہ آتے اس لئے فرمایا کہ وہ شیعہ خیال کے شخص تھے اگرچہ روایات ان کی بعض شرائط کے ساتھ قبول کر لی جاتی ہیں۔ مگر اپنے مخصوص تصورات کی بنا پر امام جماعت کی انکی نگاہوں میں چندان حرمت نہ تھی ممکن ہے حضرت فضیلؒ کے اس ارشاد سے ان کی کچھ اصلاح ہو گئی ہو۔

۲۔ حافظ اسحاق بن موسیٰ اللانضاریؒ: امیر المؤمنین المتوکل علی اللہ کے زمانے میں نیشاپور کے قاضی تھے، امام مسلمؒ امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ کی انتاد امام ذہبیؒ فرماتے ہیں۔ کان من ائمة الحدیث وصاحب سنت قنا (وہ حدیث کے ائمہ میں ہیں اور عالم سنت ام سلمہؓ)

۳۔ حافظ ابو بکر بن ابی الدنیاؒ۔ بالولاء اموی قریشی ہیں، امام بخاریؒ اور امام ابو داؤد کے شاگرد اور امام ابن ماجہ کے استاد ہیں (رم ۸۸۷ھ) امیر المؤمنین المعتز بالله عباسیؒ اور دوسرے نو ہمالان خاندانہ خلافت کے اتالیق رہے اور ان کی تربیت کی۔

امام اوزاعیؒ۔ ابو نعیم اصفہانیؒ نے حلیۃ الاولیاء میں بڑی تفصیل سے مرجع اہل شام امام اوزاعیؒ اور امیر المؤمنین المنصورؒ کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ (ص ۱۶ ص ۱۳۵) مگر اس تفصیل میں جو احادیث حضرت اوزاعیؒ نے بیان کی ہیں ان کی صحت مشکوک ہے اور بعض بالکل بے پایہ ہیں۔ غالباً کسی راوی نے تصرف کیا ہے۔ بہر حال امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں۔

بعث الی ابو جعفر امیر المؤمنین
وانا بالساحل فانتہ فلما
وصلت الیہ وسلمت علیہ
بالخلافة رد علیّ واستجاسنی
ثم قال ما الذی ابطاء بک
عنایا اوزاعی؟ قلت وما
الذی ترید یا امیر المؤمنین
قال ارید الاخذ عنکم و
الاقتباس منکم۔ قلت
یا امیر المؤمنین انظر ولا
تجهل شیئاً مما اقولک قال
وکيف اجهل وانا اسألك

مجھے ابو جعفر المنصور امیر المؤمنین نے طلب کیا
میں اس وقت ساحل پر تھا، چنانچہ ان کے
پاس گیا جب قریب پہنچا اور خلافت کے
آداب بجالایا تو انھوں نے مجھے سلام
کا جواب دیا، اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا
اوزاعی آپ کو ہمارے پاس آنے سے کس
بیزاری نے روکا تھا؟ میں نے عرض کیا امیر
المؤمنین آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں
فرمایا میں آپ سے کچھ حاصل کرنا اور فیض
اٹھانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا امیر المؤمنین
غور کیجئے اور جو کچھ میں آپ سے کہوں
اس سے غافل مت ہو جائیے۔ فرمایا

عنه وقد وجهت فيه اليك
واقدمتها له؛ قلت ان تسبحة
ولا تحمل به، قال فصاح
بي الربيع واهوى بيده الى
السيف فانهزرة المنصور
قال هذا المجلس مثنوية الا
عقوبة - فطابت نفسي
انبسطت في الكلام -

جب یہ مجلس ختم ہو گئی اور میں رخصت ہوتے لگا تو امیر المؤمنین نے فرمایا

شكرت لك نصيحتك و
قيامتها بقول والله الموفق
للخير والمعين عليه وب
استعين و عليه التوكل و
وحيبي و نعم الوكيل فلا
تخلني عن مطالعتك ايامي
بمثابها فانك المقيول غير
المتهمة في النصيحة - قلت
افعل ان شاء الله -

میں غافل کیسے ہوں گا جب کہ میں آپ سے
پوچھ رہا ہوں آپ کو پاس قاصر بھیجا
اور آپ کو یہاں بلایا میں نے کہا یوں
کہ آپ جو نہیں اسپر عمل نہ کریں اس پر
ربیع نے مجھے ڈانٹا اور تلوار کے قبضے
پر ہاتھ رکھا تو المنصور نے انھیں جھڑپ
”یہ محفل جزا کی ہے ہزار کی نہیں“ تو
مجھے اطمینان ہوا اور کھل کر بات کی

میں آپ کی نصیحت کا شکر گزار ہوں اور
میں نے اسے دل سے قبول کیا اللہ تعالیٰ
ہی بھلائی کی توفیق دینے والا ہے اور
وہ اس پر مدد کرنے والا۔ میں اسی
سے مدد طلب کرتا ہوں اسی پر بھروسہ
رکھتا ہوں اور وہی میرے لئے کافی
اور بہترین کارساز ہے آپ اپنی
توجہات سے مجھے محروم نہ رکھئے گا
کیونکہ خیر خواہی میں آپ مقبول ہیں
اور متہم نہیں۔ میں نے کہا ان شاء اللہ
ایسا ہی کرتا رہوں گا۔

چنانچہ دونوں بزرگوں میں مراسلت ہوتی رہتی تھی اور امیر المؤمنین

موصوف ان کی سفارشات قبول فرماتے تھے۔ یہاں اس کی تصریح نہیں کی کہ امیر المؤمنین نے دینی کتابیں لکھتے پر انھیں متوجہ کیا لیکن یہ کام اپنے اسی ملاقات کے بعد کیا تھا۔ جیسا کہ امام ذہبی رحمہ اللہ میں ان کے حکام کریم کی طرف اشارہ کیلئے۔ مذہب اوزاعی کے ایک حلیہ القدر غلام کفریہ راجح عبد الرحمان بن ابراہیم بن عمرو بن میمون رحمہ اللہ امام ذہبی نے ان کے متعلق لکھا ہے "حافظ عریض، فقیہ کبیر ابو سعید اموی بطریق ولای دمشق کے رہنے والے تھے۔ مذہب اوزاعی کے جمیع اور شام کے محدث امام ترمذی کے علاوہ صحاح کے تمام مؤلف ان کے شاگرد ہیں۔ یہ اموی امام پہلے اردن اور فلسطین میں عرصہ دراز تک قاضی رہے۔ اس کے بعد کو امیر المؤمنین المتوکل علی اللہ نے مصر کا قاضی القضاۃ بنایا لیکن یہ عرصہ سمجھانے سے پہلے آپ وفات پا گئے۔

غرض یہ ہے کہ اہل ہوائے خلافت اسلام میں اور علماء وفقہاء امت کے مابین منصب خلافت کے استحقاق کے لئے جو روایتیں و قیاس کی ہیں، اکابر علماء و خلفائے ہر مہمان یا مریض ہیں اور صدیوں بعد کے مصنفین نے ان روایات کو بے امتیازی یا تو منصب کے باریب اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمارے تمام ائمہ و تالیف عصر کے ساتھ تعاون اور ان کے فرامین کی پیروی کو ضروریات دین میں سمجھتے تھے جیسا کہ حنفی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو وصیت کی ہے۔ اور آپ کے پیروں ارشاد صحاح میں مروی ہیں۔ بخلاف ان کے ارشاد مبارک ہے ریح بخاری کتاب الفتن حضرت جزیہ بن زبیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کثرت کے بارے میں کچھ سوال کئے۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاہلیت اور مشرکیت تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ ہمارے پاس یہ خیر لے آیا یعنی اسلام، تو کیا اس خیر کے بعد کچھ شر آجائے گا؟ فرمایا ”ہاں“، یعنی ارتداد و عرب و پھر میں عرض کیا ”اس شر کے بعد خیر ہوگی؟“ فرمایا ”ہاں مگر اس میں کمزوری رہے گی“ میں نے عرض کیا ”کمزوری کیا ہوگی؟“ فرمایا ”ایسے لوگ ہوں گے جو میری راہ سے ہٹ کر عمل کریں گے، ان کی کوئی بات تمہیں پسند ہوگی اور کوئی ناپسند“ میں نے عرض کیا ”اس خیر کے بعد تو شر نہیں آئے گا؟“ فرمایا ”ہاں جہنم کے دروازے پر بلا نیوالے کھڑے ہوں گے اور جو بھی ان کی طرف جھکے گا وہ اسے جہنم میں دھکیل دیں گے میں نے عرض کیا ”ان کی کچھ نشانیاں تو بتائے“ فرمایا۔ ہمیں میں سے ہوں گے اور ہماری ہی زبانیں بولیں گے۔ یعنی کہیں گے اپنے آپ کو مسلمان، مگر عقائد و اعمال میں کتاب و سنت اور اجماع صحابہ کے خلاف ہوں گے میں نے عرض کیا ”اگر ایسا وقت آجائے تو میرے لئے آپ کا کیا حکم ہے؟“ فرمایا ”مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے وابستہ رہنا۔“

علماء اور خلفاء کے یا بھی تعاون اور احترام ہی کی یہ برکت تھی کہ دین اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا میں پھیلا، فتوحات اسلامیہ کا دار و بڑھا اور اقوام عالم میں ثقافت اسلامیہ کی عظمت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ویسے ہمارے اسلام کو کراہت

ہوئیں اور بعض بعض کے مابین تو تلخی بھی پیدا ہوئی۔ کشت و خون بھی ہوا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پوری تاریخ پر خط قسح پھیر کر کوئی یہ کہہ دے کہ چند قدم راہِ راست چل کر جو یہ امت پہنچی تو ہٹتی ہی چلی گئی یا بقول ان مودودی صاحب کے منگدھ کے بعد امت کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی گو یا تمام صحابہ جو منگدھ کے بعد زندہ رہے اور تمام ائمہ و علماء و فقہاء امت سب جاہلیت کے پیرو چلے آتے ہیں نعوذ باللہ من شر الوسواس الخناس۔

وفات امام امام اعظمؒ کی وفات کے سلسلے میں ایک مکروہ بات کو پوری شہرت دی گئی ہے یعنی امیر المومنین المنصور نے امام اعظمؒ کو قاضی بنانا چاہا وہ تیار نہیں ہوئے تو قید کر دیا گیا، تازیانے لگا کر گئے اور بالآخر زہر دیکر شہید کر دیا گیا۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک نظام خلافت باطل تھا۔ اور آپ چاہتے تھے کہ خلافت علویہ میں آئے۔ یعنی آپ کے نزدیک دین اور ملت اور دعوت تو کوئی چیز نہ تھی ایک مخصوص خاندان کی حاکمیت پر عقائد و اعمال کی صحت کا مدار تھا۔ صفیات گزشتہ میں ان خرافات کی تنقیح کی جا چکی ہے۔ یہاں ہم صرف آپ کی وفات کے بارے میں صحیح واقعہ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ قید و تازیانہ اور زہر دینے یا یاہمی لیے حرمتی کی تمام داستان از سر تپا یا باطل ہے۔ اور قریب العهد مصنفوں نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی۔

قریبی زمانہ طبری کا ہے (م ۳۱۱ھ) اکھفوں نے امام صاحب کے بارے میں تین روایتیں لکھی ہیں اور ان میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ امام صاحب کو قید کیا گیا، کوڑے برسائے گئے یا زہر دیا گیا۔ پہلی روایت تو وہ

ہے جو تعمیر بغداد کے سلسلے میں ہم نقل کر چکے کہ امیر المومنین المنصور نے انھیں صاحب فضل و عدالت و تفقہ و امانت سمجھ کر بغداد طلب کیا۔ اور اپنے خدمت مفوضہ انجام دی۔ دوسری روایت یوں ہے۔

ان المنصور اراد ان يا حنيفة النعمان بن ثابت فامتنع عن ذلك فحلف المنصور ان يتولى له و ابو حنيفة الا يفعل قوله القيام ببناء المدينة و ضرر الذين و عاده و اخذ الرجال بالعمل قال و انما فعل المنصور ذلك ليخرج عن يمينه۔ قال و كان ابو حنيفة المتولى لذلك حتى فرغ من استتمام بناء حائط مما يلي الخندق و كانت استتمامه في سنة ۱۱۹ھ

المنصور نے ابو حنيفة نعمان بن ثابت کو قاضی بنانا چاہا مگر انھوں نے اس سے انکار کر دیا اس پر المنصور نے قسم کھائی کہ انھیں انکی خدمت انجام دینی ہوگی اور ابو حنيفة نے قسم کھائی کہ وہ ایسا نہیں کریں گے اس لئے انھیں شہر کی تعمیر کیلئے ایٹھیں بنوانے اور گننے اور لوگوں کو اس کام پر لگانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ راوی کہتا ہے کہ المنصور نے یہ شخص اپنی قسم پوری کرنے کیلئے کیا۔ پھر کہتا ہے کہ ابو حنيفة اس کام کے متولی رہے یہاں تک کہ شہر کی وہ تفصیل مکمل ہو گئی جو خندق سے ملحق تھی۔ اور یہ تکمیل ۱۱۹ھ میں ہوئی۔

تیسری روایت ہے۔

ان المنصور عرض علی ابی حنيفة القضاء و المظالم

المنصور نے ابو حنيفة کو قضاء و المظالم کی دادرسی کی خدمت سپرد کی

فامتنع خلفان لا يقطع
عنه حتى يعجل - فامخير بنناك
ابو حنيفة فد عا بقصبة فعلا
اللين على رجل قد لبنة و
كان ابو حنيفة اول من عل
اللين بالقصيب فاخرج ايا
جعفر عن يمينه واعتل و
مات بعد اذ -

کی لکرا کھوں نے انکار کر دیا اسپر المتصد
تسم کھائی کہ اکھیاں سو وقت تک نہیں
چھوڑیں گے جیتک وہ کوئی خدمت
انجام نہ دیں۔ ابو حنیفہ کو جب اسکی
خوردی گئی تو اکھوں نے ایک چھری
منگوائی اور جس شخص نے اینٹیں بنائی
تھیں اسکی اینٹیں گئیں ابو حنیفہ
پہلے شخص میں جھوٹے آئے چھری
اینٹیں گئیں۔ اس طرح اکھوں ابو جعفر کی قسم پوری کر دی پھر وہ بیمار ہو گئے
اور بغداد میں وفات پائی۔

مرتب یہ ہیں روایتیں ہیں جو طبری نے اس سلسلے میں بیان کیں اس کا
اشارہ بھی نہیں کہ ان دونوں بزرگوں کے مابین کوئی تعلق تھی اور امام شافعی
پر وہ تشدد کیا گیا جو اچھے کے لیگوں نے بیان کیا ہے، تا علی اور ربیعہ کے بیان
اس قسم کی باتیں کبھی نہ کبھی ہوتی رہی رہتی ہیں۔ آخری روایت میں امام شافعی
کی وفات بیماری کے سبب بیان کی گئی ہے کہ کورڈوں کی ضرب یا زہر
خوزانی کے ذریعہ۔ یعنی ان کی وفات طبعی تھی۔

روایتیں اگرچہ ہیں لیکن شرح روایت وہی ہے کہ بن حضرات کو
ان کے علم و تقویٰ اور دیانت کے علاوہ فن تعمیر میں مہارت کی بڑا پرہیز
کیا گیا تھا ان میں امام عاصم حبیبی تھے۔ اس خدمت کو شریعہ بالاروایت
میں خشت تعمیر کر دیا گیا۔ بریائے دیانت و تقویٰ لکرائی تعمیر کی اس
خدمت کے علاوہ جو دوسری دو علمی خدمتیں تھیں ان میں آپ نے بخوبی انجام

دیا وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ حضرت تاج بن ارطاة بھی
 فقیہ اور عالم تھے۔ بغداد کی جامع مسجد اہلی کی گرائی میں تیار ہوئی تھی لیکن
 ان کے یا کسی دوسرے بزرگ کے متعلق خطیب نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی
 صرف امام صاحب کو ان مضمولیات کے لئے خاص کیا ہے۔ یہ محض اس تعصب
 کے سبب ہے جو انھیں امام صاحب سے تھا۔ اور مقصد ان کی توہین ہے اور
 یہ دکھانا کہ امیر المؤمنین المنصور کے نزدیک ان کی کوئی حرمت نہ تھی۔ حتیٰ کہ
 انھوں نے یہ لغو روایت بھی لکھ دی راہم المصیب ص ۱۲۳-۱۲۴ طبع دیوبند
 راوی بیان کرتا ہے کہ اس نے ابو مسہر کو یہ کہتے سنا کہ
 فلاں کے باپ پر ائمہ مساجد اس منبر سے لعنت کیا کرتے تھے
 اور اشارہ دمشق کے منبر کی طرف کیا۔ فریبانی کہتے ہیں کہ فلاں
 کے باپ سے مراد ابو حنیفہ تھے۔

یہ روایت نقل کر کے سلطان اعظم فرماتے ہیں۔

لم یکن غرض الخطیبان ینکر
 هذا عن ابی حنیفة انما جعل
 اباحنیفة ذریعة ولاد ان
 ینکر الناس بما نقل مما کان
 علی منبر دمشق ولما تنبع
 رجال هذا السند بالكشف
 لعلم الناس بمن اراد بالحکایة
 وشهرة البغیر اغنت عن
 ذکره۔ لانما احدا لا یلغی

خطیب کی غرض یہاں یہ نہیں ہے کہ ابو
 حنیفہ کا ذکر کریں۔ انھوں نے تو ابو حنیفہ
 کو ذریعہ بنایا ہے کہ منبر دمشق پر جو کچھ
 ہوتا تھا اسے لوگ ذہن میں رکھیں۔
 اس سند کے راویوں کی تحقیق نہیں کی
 کہ اس حکایت میں جس شخص کا ذکر
 مقصود ہے اسے تو کون کی معلوم
 کے لئے دریافت کروں کہ اس خبر کو
 مشہور کر کے کس کے ذکر کو ناپاک

لی المنیر الا باذن الاماؤ
وحنیفة کان فی دولة بنی
عباس فی زمن المنصور قلو
عن علی منبر دمشق لکان
عن علی منابر العراق اذ
فی دار الخلافة - ولم یقل
هذا الخطیب ولا غیره

کیا گیا ہے، کیونکہ کوئی شخص خلیفہ
وقت کی اجازت کے بغیر منبر پر ایسی
لغویات نہیں کر سکتا، ابو حنیفہ المنصور
کے عہد میں خلافت عباسیہ کی شہری
تھے اگر ان پر دمشق کے منبر سے لعنت
ہوتی تھی تو عراق کے منبر پر بھی
ہوتی ہوگی، کیونکہ وہ دارالخلافت تھا
لیکن ایسی بات نہ خطیب نے ہی ہے اور نہ کسی دوسرے شخص نے۔

خطیب کو امیر المؤمنین المنصور سے تعصب نہ تھا، لیکن امام صاحب
سے تھا اور اپنے تعصب میں وہ اتنے پہنچ گئے کہ لوگوں کی نگاہوں سے انھیں
گراتے کے لئے یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ بے حیثیت شخص تھے اور امام مسلمین
کے ہاں ان کی کوئی حرمت نہ تھی۔ ابن ہلکان نے وفیات الاعیان میں
خطیب کی اس حرکت پر نکتہ چینی کی ہے کہ ان جیسے صاحب علم کو اس قسم
فہمیت سے بلند ہونا چاہئے تھا۔ لیکن یہاں دیکھنا چاہئے طبری کو، جنہیں
اپنے مخصوص شیعہ عقائد کی بناء پر تہ امیر المؤمنین سے کوئی دلی تعلق تھا
اور نہ امام صاحب سے۔ اور وہ خطیب سے بہت پہلے گزرے ہیں انھوں
نے اس قسم کی کوئی بات کیوں نہیں بیان کی۔ حالانکہ ایسی کوئی روایت
انھیں پہنچی ہوئی تو اسے بخوشی نقل کرتے۔

طبری کے بعد قریب ترین عہد کا مورخ مسعودی ہے۔ اسے بھی اپنے
مخصوص عقائد کے تحت ان دونوں بزرگواروں سے کوئی دلی تعلق نہیں
ہو سکتا تھا، اس لئے تو کیا صحابہ پر طعن کی بہت سی باتیں لکھی ہیں۔

لیکن امام صاحب کی وفات کے سلسلہ میں صرف اتنا لکھا ہے ربيع الزہدی
 وفي سنة خمسين ومائة مات ابو حنیفة النعمان بن ثابت مولى تیمم اللات بن بکر بن وائل کے موالی میں تھے، اکھنوخ بعد امیر المؤمنین المنصور بغداد وفات پائی۔ نماز پڑھتے وقت کی حالت میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ اس وقت شتر برس کے تھے۔

تذکرین

امام صاحب کو امیر المؤمنین المنصور نے سرکاری اعزاز کے ساتھ اپنے قاترانی قبرستان میں دفن کروایا۔ ابن قتیبة رم ۲۸۶ جو طبری سے بھی پہلے گزرے ہیں اکھنوخ نے المعارف میں امام صاحب کا تذکرہ اس عنوان سے کیا ہے "ابو حنیفة صاحب الراى رضی اللہ عنہ" اور فرماتے ہیں۔

وفات ببغداد فی رجب سنة خمسين ومائة وهو يومئذ ابن سبعین سنة ودفن فی مقابر الخیفة سادات۔

آپ کی وفات بغداد میں ہوئی رجب ۵۰ھ میں۔ اس وقت آپ شتر برس کے تھے۔ اور مقابر خیران میں دفن کئے گئے۔

امیر المؤمنین نے جن حضرات سے خدایات نلیہ میں اور جن کی ان کو دل میں قدر تھی ان کی وفات پر اعزازاً اپنے قاترانی قبرستان میں جگہ دی۔ سیدہ خیران امیر المؤمنین ہارون الرشید کی والدہ ماجدہ تھیں۔ بعد میں یہ قبرستان انہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چنانچہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں۔

اول من دفن فیہا الباقون
بنت المہدی ثم الخیزران
ودفن فیہا محمد بن اسحاق
صاحب المغازی، والحسن
بن زید، ولعمان بن ثابت
وقیل ہشام بن عروۃ۔

سب پہلے وہاں امیر المؤمنین المہدی
کی صاحبزادی باقونہ دفن ہوئیں پھر
سید خیزران۔ اور وہیں محمد بن اسحاق
دفن ہوئے نیز حسن بن زید اور نعمان
بن ثابت اور کہتے ہیں ہشام بن
عروہ بھی۔

یہ حضرت حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب، امیر المؤمنین کے ہاں
نہایت مقرب تھے اور ان کی طرف سے مدینہ طیبہ کے والی بھی رہے ہیں پھر آپ نے
اکھنیں اپنا ندیم بنالیا اور وفات پر اپنے قبرستان میں اکھنیں دفن کیا۔
ہشام بن عروۃ بن الزبیر۔ سیدنا زبیرؓ کے پوتے تھے اور اکھنیں علم الہیات
اور تاریخ کا علم اپنے والد ماجد حضرت عروۃ سے ملا جو حضرت ام المؤمنین
عائشہؓ کے سگے بھائی تھے اور شاگرد رشید تھے۔

۱۹۲
اسی طرح ابو عبد اللہ الحاکم نے ”معرفۃ علوم الحدیث میں لکھا ہے (ص ۱۹۲)
ابو عبد اللہ کہتے ہیں مدینہ السلام بغداد
کے متعلق مجھے علم نہیں کہ وہاں کسی صحابی
کی وفات ہوئی ہو مگر یہ ہے کہ تابعین
اور اتباع التابعین میں سے ایک جماعت
وہاں آئی اور وہ حضرات یہیں دفن
ہوئے۔ ان میں ہشام بن عروۃ بن
الزبیرؓ ہیں اور محمد بن اسحاق بن یسار

قال ابو عبد اللہ فاما مدینۃ
السلام فانی لا اعلم صحابیاً توفي
یہا۔ الا ان جماعۃ من التابعین
واتباع التابعین نزلوا ہا و ماتوا
یہا۔ منهم ہشام بن عروۃ
بن الزبیر و محمد بن اسحاق
بن یسار و اسماعیل بن سالم

الاسدی ابو حنیفة الفقیہ و
شیبان بن عبد الرحمن النخعی
و ابراہیم بن سعد الزہری
جماعة هؤلاء فی مقبرة
الخيزران۔

اسماعیل بن سالم الاسدی، ابو حنیفہ
الفقیہ، شیبان بن عبد الرحمن النخعی
اور ابراہیم بن سعد زہری ہیں۔
سب حضرات مقبرہ خیزران میں
دفن ہیں۔

اس تدفین کے عمل ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر المؤمنین المنصور
کے ہاں امام اعظم کا کتنا احترام تھا مگر ہوا پرست لوگوں نے امت کے ان عظیم
المرتبہ اماموں کے بارے میں کیسی لغو اور فضول باتوں کو شہرت دی ہے
علماء امت دین کی بنیاد پر خلفاء اسلام کے ساتھ اپنے روابط مضبوط
رکھتے تھے۔ اور خلفاء کے ہاں بھی علماء امت کا بغایت احترام تھا۔ اسی وجہ سے
علوم و فنون کی ترویج ہوئی اور ثقافت اسلامیہ کو فروغ ہوا۔ کتنے بزرگوں کے
احوال ہیں۔ جنہوں نے اگر خلفاء اسلام کے ہاں وفات پائی تو انکی تدفین بزرگی
اعزاز سے ہوئی اور امیر المؤمنین نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ابو عبد اللہ الحلی
لکھتے ہیں (معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۹۲) کہ عبد العزیز بن عبد اللہ بن ابی سلمہ
الماجنونی جو اکابر علماء میں ہیں وہ بغداد شریف لائے اور وہیں وفات پائی تو امیر المؤمنین
المہدی عباسیؑ ان کو دفن میں شریک ہوئے خود نماز پڑھائی اور مقابر قریش میں انہیں
دفن کیا، اسی طرح عبد الملک بن محمد بن ابی بکر بن حزم کو امیر المؤمنین الرشیدؑ نے قاضی
بنایا۔ ان کی وفات پر خود نماز پڑھائی اور مقابر قریش میں انہیں دفن کیا اور ایسے ہی
سیکڑوں واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا پرست لوگوں نے خلافت قائم
اور علماء و فضلاء امت کے مابین اختلافات کے جو فرضی واقعات بیان کر کے نظام
خلافت کو باطل قرار دینا چاہا ہے وہ اپنے بیان میں کاذب ہیں اور افترا پر دان

امام اعظم ابو حنیفہ اور شیعیت

امیر المؤمنین سیدنا عثمان ذوالنورین صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ،
 روئے زمین کے عظیم ترین حکمران تھے جن کے ایک اشارے پر ملک کے ملک فتح
 کر ڈالے جاتے تھے۔ جن کے احکام سے سرتابی کو خدا اور رسول کی نافرمانی سمجھا جاتا
 تھا اور جن کی شخصیت صحابہ کرام کی نگاہ میں محبوب ترین تھی۔ شاعر اپنی نحو و یہ
 کہتا ہے۔ اَحِبُّكَ وَالرَّحْمٰن - حُبِّ قُرَيْشِ عُمَانِ رَجَدَا مِنْ تَحْتِ سَیِّ
 ایسی محبت کرتا ہوں جیسی محبت قریش کو عثمان سے ہے (اس سرآمد محبوبان بارگاہ
 اہدیت و رسالت کو چند بے رنگ و نام لوگوں نے خاص دارالخلافہ میں شہید کر ڈالا
 اور سب دیکھتے دیکھتے رہ گئے۔ یہ سانحہ اس امام برحق کے محض اس امر ارادے
 کے سبب ہوا کہ کسی کلمہ کو پرتلوار نہ اکھائی جائے۔ ورنہ ایسا کرنے والے کو میں
 اپنی بیعت سے خارج کر دوں گا۔ اس منظر کا نقشہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ
 عنہ یوں صیغہ ہے۔

فَكَفَّ يَدَايِهِ وَأَغْلَقَ بَابَهُ
 وَأَيُّقَنَ أَنَّ اللَّهَ أَيْسَى بِعَاقِلٍ
 انہوں نے اپنے ہاتھ روک لئے اور پھر گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ اور یقین رکھا کہ اللہ تعالیٰ
 عاقل نہیں اور ہر کچھ دیکھ رہا ہے
 وَقَالَ لِأَهْلِ الدَّارِ لَا تَقْتُلُوهُمْ
 عفا اللہ عن کل امرئ لم یقاتل
 جو لوگ گھر کی حفاظت کیلئے جمع تھے ان سے فرما دیا انہیں قتل مت کرنا خدا ہر اس شخص
 کو بخش دے جو تلوار نہ اکھائے۔

فَكَيْفَ رَأَيْتَ اللَّهَ صَبَّ عَلَيْهِمُ السَّحَابُ وَالْبُخْتَامُ يَصِلُ الْفُتُوحُ

تو دیکھ لو اللہ نے ان لوگوں کو ایک جہتی کے بعد ان کے مابین کس طرح عداوت و بغض کو مسلط کر دیا۔

وَكَيْفَ رَأَيْتَ الْخَيْرَ إِذْ بَرَعَدُ
عَنِ النَّاسِ إِذْ بَارَ الزَّلِيلُ الْجَوَّ
اور دیکھ لو ان کی شہادت کے بعد بھلائی نے لوگوں کی طرف سے کیسے منہ موڑ لیا۔
تیز و تند ہوا اسے اڑا لے گئی ہو۔

خوابہ حسن بصری اس وقت چھ سات برس کے تھے مگر یہ منظر جو بچہ
خود بھی دیکھا اور بزرگوں سے سنا انھیں خوب یاد تھا۔ فرماتے ہیں تفسیر المنار
خرج علينا عثمان بن عفان
رضي الله عنه يومًا بخطبتنا
فقطعوا عليه كلامًا فتراموا
بالبطحاء حتى جعلت ما البصر
اديم السماء قال وسمعت
صوتًا من إحدى حجازة
النبى صلى الله عليه وسلم
فقبل هذا صوت أم المؤمنين
قال سمعتها وهي تقول الا
ان نبيكم قد برى فمن فرق
دينه واحتزب قالت ان
الذين فرقوا دينهم
كانوا شيعًا كنت منهم في
شيء

امیر المؤمنین عثمان بن عفان
تشریف لائے تو لوگوں نے آپ کو
بات کاٹ دی اور اتنی کنکر یا
پھینکیں کہ فصا پر چھ گئیں اور
مجھے آسمان نظر نہیں آتا تھا اس
میں ازواج مطہرات کے ایک حجر
سے آواز بلند ہوئی اور کہا گیا کہ
ام المؤمنین عائشہ صلوات اللہ علیہا
کی آواز ہے آپ فرما رہی تھیں
رکھو تمہارے نبی اس شخص سے
بری ہیں جس نے اپنے دین کو ٹکڑے
ٹکڑے کر کے گروہ بندی کی پھر
آیت پڑھی جن لوگوں نے اپنے دین
کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ بندی

ن گئے وائے بنی تمہارا ان سے کسی یار سے میں کوئی تعلق نہیں ہے

یہ تھی اس منظر حمال خلیل اللہ اور پیر تو کمال ذریعہ اللہ کی شہادت عظمیٰ
میں کی نظیر از آدم تا ایندم کہیں نہیں ملتی کہ پوری طاقت رکھتے اور اپنے ذرا
ان جمعیت کے باوجود آدمی تلوار نہ اٹھانے دے اور جان جان آفریں کے سپرد کر دے

یہ کاشانہ خلافت کی حفاظت کرنے والوں میں عبد اللہ بن عمر عبد اللہ بن عباس محمد بن طلحہ بن
عبد اللہ بن الزبیر مروان بن حکم حسن بن علی جیسے حضرات تھے۔ چھت پر پیر دینے
والوں میں ابو ہریرہ جیسے بزرگوار تھے، ام المؤمنین ام حبیبہ صلوات اللہ علیہا جب
باغیوں کو سمجھانے اور شکستہ آپ پہنچانے تشریف لائیں تو اشتر نخعی نے آپ کے حجر
کے منہ پر گھونسا مار کر اس کا رخ پھیر دیا، امیر المؤمنین کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے
ابن عباس کو حکم دیا کہ ازواج مطہرات کو لے کر فوراً مکہ چلے جائیں انھوں نے
عرض کیا کہ میرے نزدیک حج سے زیادہ ضروری ان باغیوں کے خلاف جہاد
معلوم ہوتا ہے۔ مگر آپ نے سرکاری طور پر انھیں امیر حج بنا کر روانہ کر دیا
اور ساتھ ہی ایک مکتوب دیا کہ حاجیوں کو سنا دیں تاکہ مدینہ کی صورت حال
انھیں معلوم ہو جائے۔ محافظوں کی طرف سے یار بار عرض کیا جاتا تھا کہ قتال
کی اجازت مل جائے مگر اس پر کسی طرح تیار نہیں ہوئے حتیٰ کہ آخر میں سب اپنے
گھر خالی کر لیا۔ ابن الزبیر سب کے بعد نکلے تھے۔ کیونکہ حضرت ابن الزبیر کو
امیر المؤمنین نے اپنا وصی مقرر کیا تھا۔ مکان تو خالی ہو گیا مگر محافظ دروازے
پر برابر موجود رہے۔ امیر المؤمنین شہادت کے لئے پوری طرح تیار ہو کر تلاوت
کلام پاک میں مشغول تھے کہ برابر کے ایک بنی گھریں سے چڑھ کر حید
باغی اندر آ گئے اور آپ کو شہید کر دیا۔ آسمان راجت بود گریخوں برابر دہرائیں
(باقی صفحہ ۱۴۳ پر)

پھر اپنی قاتلوں کے ہاتھوں حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا اس سے اس وقت مسلمانوں کے دو سیاسی گروہ پیدا ہو گئے اور حالات ایسے ہو گئے کہ کشت و خون تک نہایت پہونچی۔

جس گروہ نے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کر لی تھی اور ان میں بعض صحابی بھی تھے، یہ لوگ شیعہ علی کہلائے۔ ان کا موقف تھا کہ اولین مسلمان حضرت علیؓ کی بیعت کی تکمیل کا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مسائل ہیں ان کے مقابلے میں وہ صحابہ اور دیگر حضرات تھے جن کے نزدیک اولین مسلمان خون عثمانؓ کے قصاص کا تھا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا، کیونکہ وہ اس بیعت کے انعقاد کا طریقہ درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ یہ نئی خلافت شہید مظلوم کے قاتلوں نے برپا کی تھی اور وہی اس کے کرتادھرتا بنے ہوئے تھے۔ یہ حضرات شیعہ عثمان کہلائے۔ ان میں بھی اجلہ صحابہ تھے، یعنی عشرہ مبشرہ میں حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور پھر سب سے بڑھ کر ام المؤمنین عائشہ صدیقہ صلوات اللہ علیہا۔ حضرت معاذؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہم اسی اختلاف کے سبب جبل و صفین کے معرکے ہوئے۔ لیکن شیعہ علیؓ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور حضرت علیؓ کی خلافت کی آئینی حیثیت آخر وقت تک معرض بحث رہی تا آنکہ آپ کے ایک باغی فروئے آپ کا

(یقینہ ۱۲۱) آپ کی زوجہ محترمہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب دیکھا تو آپ کے اوپر جھک گئیں۔ لیکن آپ کی انگلیاں کٹ گئیں اور آپ کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔ محمد بن ابی بکر، عمر بن الخطاب اور کنانہ بن بشر اس ٹولی میں تھے۔

شہید کر دیا۔ یہ اختلاف خالص سیاسی تھا۔ اور اجتہاد پر مبنی۔ اسے پر امن طریقے پر طے کیا جاسکتا تھا اور اس کے مواقع بھی یار یا پید ہوئے نگرامت کے اندرونی دشمنوں کے سبب ایسا نہ ہو سکا اور مفت میں خویر نہ ہوئی، اس نزاع کے سیاسی اور اجتہادی ہونے کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ اگر ایک طرف حضرت علیؓ ہیں تو دوسری طرف ان کے سگے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ۔ اگر حضرت علیؓ کی طرف مہاجر بن خالد بن ولیدؓ ہیں تو حضرت معاویہؓ کی طرف ان کے بھائی عبدالرحمان بن خالد بن ولیدؓ اگر حضرت علیؓ کے ساتھ محمد بن ابی بکرؓ ہیں تو حضرت معاویہؓ کے ساتھ ان کے بڑے بھائی حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ اگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ ابنا ہیں تو ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ہیں معلوم ہوا کہ شیعہ علیؓ اور شیعہ عثمانؓ میں نہ کوئی دینی اختلاف تھا اور نہ خاندانی جھگڑا، بلکہ یہ دو سیاسی گروہ تھے جو فلاح امت کے لئے اپنے اپنے موقف کو صحیح سمجھتے تھے۔ اور انھیں اپنی حقانیت اور عزائم کے تعمیری ہونے کا ایسا یقین تھا کہ ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھانے سے بھی وہ باز نہ رہ سکے۔

لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بن العاص اگرچہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ہیں لیکن جنگ میں حصہ نہیں لیتے اور اسے مفادِ ملت کے خلاف جانتے ہیں اسی طرح حضرت حسنؓ ہیں تو اپنے والدِ راہد کے ساتھ مگر قتال سے انھیں بھی گریز ہے اور چاہتے ہیں کہ امت کا کلمہ متحد رہے۔ اور خوں ریزی نہ ہو۔ حضرت معاویہؓ کو حضرت

۱۔ یہ مواقف تو صحابہ کرام کے بیان ہوئے ان کے علاوہ بھی تابعین و باقی صحابہ

علیؑ کی بیعت سے انکار نہیں بشرطیکہ وہ قاتلان عثمانؓ سے بے لعلق ہو جائیں
حضرت علیؑ کو قصاص عثمانؓ کے وجوب سے انکار نہیں مگر چاہتے ہیں
کہ اول ان کی بیعت کی تکمیل ہو۔

ساری پیچیدگی ان قاتلوں نے پیدا کر دی ہے جو حضرت علیؑ کی خلافت
پر حاوی ہیں اور کوئی مسئلہ خوش اسلوبی سے طے نہیں ہونے دیتے کیونکہ

رہیقہ صفحہ ۱۲۵ کی بڑی جماعت تھی، جنہوں نے حضرت علیؑ سے بیعت کر لی تھی
اور آئینہ حیثیت سے انہیں امت کا امام چلتے تھے۔ ان کی حالت بھی یہ تھی
کہ حضرت معاویہؓ کے خلاف انہیں لڑنا گوارا نہ تھا، اول تو ان کی شخصی عظمت
اور خدمات بلیہ تھیں۔ پھر جو مطالبہ لے کر وہ کھڑے ہوئے تھے اسکی حقانیت
دلوں میں ایسی گھر کر گئی تھی کہ ان کے خلاف بردار ہونے پر ان کے قلوب
مائل نہ ہو سکے۔ حالانکہ یہ لوگ ہمدانی تھے جنہیں حضرت علیؑ سے خاص عقیدت
تھی۔ اپنی رعایا کی اس نفسیاتی کیفیت کا ادراک خود آپ کو بھی تھا، اسی
لئے جو لوگ صفین کی جنگ میں شرکت پر تیار نہ تھے انہیں اپنے دوسرے
علاقوں میں جہاد کے لئے بھیج دیا تاکہ آپ کی فوج کی صفوں میں انتشار نہ پھیلے
چنانچہ فتوح البلدان میں ہے رج ۱، ص ۲۵۸ ترجمہ

”مرد ہمدانی کہتے ہیں کہ علی بن ابی طالبؑ نے ہم سے فرمایا ”تم میں سے جو شخص ہمارے
ساتھ ہو کر معاویہؓ سے قتال پسند نہ کرے وہ اپنی عطا لے لے اور دہلیوں کی
طرف جا کر ان سے جنگ کرے، راوی کہتے ہیں میں ابھی میں تھا جنہوں نے
دوسری صورت پسند کی۔ ہم نے عطا لیں اور دہلیم کی جانب روانہ ہوئے
ہماری تعداد پانچ ہزار تھی“

انہیں اپنی خیر نظر نہیں آتی، ان کا نصیب العین ہے کہ امت میں فساد ہو۔ اور انتشار پھیلے، ان کے عزائم کے یار و ور ہونے کی سبیل ہی یہ تھی کہ امت کا کمر متفرق رہے اور امتلاف کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔ اسی لئے اس سیاسی خلفشار کو وہ نہ ہی اور خاندانی رنگ دے کر فرقہ بازی کے درپے ہیں۔ تاکہ امت کا مستقبل تباہ ہو۔ حضرت علیؓ کی خواہش بھی تھی کہ اس حقیقت کو صرف سیاسی سمجھا جائے۔ اور فرقہ بازی پیدا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ یہ مسئلہ صاف کرنے کے لئے آپ نے صدیقین کے بعد ثالثی نامہ ہونے پر اپنے اولیٰ اہل شام کے بارے میں ایک گشتی مراسلہ جاری کیا اور وضاحت کر دی کہ ان جنگوں کو سیاسی کے علاوہ کوئی دوسرا رنگ نہ دیا جائے۔ یہ مراسلہ کتب تاریخ کے علاوہ بیج البلاغہ کے مصنف نے بھی نقل کیا ہے رتج البلاغہ جز ۲، ص ۱۵۹

”یہ گشتی مراسلہ ہے۔ جو (علی) علیہ السلام نے تمام شہروں میں بھیجا۔ اس میں آپ نے وہ صورت حال بیان کی ہے۔ جو آپ کے اور اہل شام کے مابین پیدا ہو گئی تھی، اس میں فرماتے ہیں۔۔۔۔۔۔“

”ہمارے معاملے کی ابتداء یہ ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا خدا ایک، ہمارا اور ان کا نبی ایک، ہماری اور ان کی دعوت اسلام ایک، اللہ پر ایمان رکھنے اور اس کے رسول کی تصدیق کرتے ہیں نہ ہم ان سے زیادہ ہیں اور نہ وہ ہم سے۔ پس معاملہ واحد۔ سوائے اس کے کہ ہم میں اور ان میں خون عثمانؓ کی بابت

اختلاف ہوا اور ہم اس سے بری ہیں۔۔۔۔۔

ان شیعہ علیؑ اور شیعہ عثمانؓ کے علاوہ امت کا سواد اعظم تھا اور صحابہ کرام کا جم غفیر ان کا موقف تھا کہ حضرت علیؑ کی بیعت کی تکمیل ہو جانی چاہئے۔ لیکن خون عثمانؓ کا قصاص بھی سب سے مقدم ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان دونوں مسئلوں کو جنگ کے بغیر یا بھی گفت و شنید سے طے کیا جائے ان حضرات کی کوشش تھی کہ ان کی طرح تمام امت کو جنگوں میں فریقیت سے گریز کرنا چاہئے۔ تاکہ پیرامن ماحول میں تصفیہ کر لیا جائے، اس سواد اعظم کے نزدیک یہی وہ فتنہ تھا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا ہے۔ عشرہ مبشرہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ، عمارؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت ابوسعودؓ، حضرت سلمہ بن الاکوعؓ وغیرہ تھے۔ امت کے ان عظیم رہنماؤں نے جس طرح لوگوں کو ان جنگوں سے محترز رہنے کی تلقین کی، اس کی تفصیلات صحاح میں موجود ہیں جنہیں نقل کرنے موجب طوالت ہوگا۔ مختصراً شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تبصرے پر یہاں

اکتفا کیا جاتا ہے (منہج السنۃ ج ۲، ص ۲۱۹ - ۲۲۰)

وكان ترك القتال خيراً للقاتلین

مع ان علیا كان اولی بالحق

هذا قول احمد والثر اهل

الحديث واكثر ائمة الفقهاء

وهو قول اکابر الصحابة و

التابعین لہم باحسان و

دونوں فریقوں کے لئے بہتر تھا کہ نہ

لڑیں اگرچہ حق حضرت علیؑ کے زیادہ

قریب تھا۔ یہ قول ہے امام احمد کا

اکثر اہل حدیث کا اور فقہاء کے اکثر ائمہ

کا اور یہی قول ہے اکابر صحابہ کا، اور

خوبی کے ساتھ ان کا اتباع کرنا اور

قول عمران بن حصین رضی
 اللہ عنہ وکان ینہی عن بیع
 السلاح فی ذلک القتال و
 یقول هو بیع السلاح فی
 الفتنة وهو قول اسامة بن
 زید و محمد بن مسلمة و
 ابن عمر و سعد بن ابی وقاص
 و اکثر من یقی من السابقین
 الاولین من المهاجرین و
 الانصار رضی اللہ عنہم
 ولہذا کان مذہب اہل
 السنة الامساک عما یشیر بہ
 الصحابة فانہ قد ثبت
 فضائلہم و وجبت موالا
 و محبتہم

اور یہی قول ہے عمران بن حصین رضی
 اللہ عنہ کہ وہ ان جنگوں میں ہتھیاروں کی
 خرید و فروخت سے روکتے تھے اور
 فرماتے تھے کہ ہتھیاروں کا یہ کاروبار
 باموجب فتنہ ہے، اور یہی قول ہے
 اسامہ بن زید کا، محمد بن مسلمہ کا
 ابن عمر کا، سعد بن ابی وقاص کا اور
 اکثر ان حضرات کا جو مابین انصاریوں
 کے اولین طبقہ کے اس وقت موجود تھے
 اسی لئے اہل السنۃ کا مذہب یہ ہے کہ صحابہ
 کے اختلاف کے ذکر پر اپنی زبان
 روکیں، کیونکہ ان کے فضائل ثابت
 ہیں۔ اور ان سے تعلق خاطر رکھنا
 اور محبت رکھنا امت پر واجب
 ہے۔

صفین کا معرکہ جنگ بدی اور ثالشی پر فتح ہوا، اور یوں فریقین نوح
 پیری سے کنارہ کش ہو گئے۔ ثالشیوں نے فیصلہ دہی کیا جو غیر جانب دار اور
 جنگوں سے محترز رہنے والے حضرات چاہتے تھے یعنی پیرا من ماحول میں صرف
 امحای رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے شوری سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
 نصاب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کی آئینی حیثیت کا تصفیہ کیا جائے ابھی
 آخری اجتماع نہیں ہوا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک خارجی نے شہید کر دیا، اور

حضرت حسن نے حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے بیعت کر لی۔ (صحیح البخاری کتاب الصلح) پھر تمام صحابہ اور جمہور امت نے حضرت معاویہؓ کی خلافت پر اجماع کر لیا۔ اہل حق کے یا بھی نزاع کا جب ایک فریق نہ رہا تو یہ قدرتی بات تھی کہ زمام امت فریق ثانی کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ سب امت جیسے پہلے ایک تھی پھر ایک ہو گئی اور پرانی باتیں سب بھلا کر اسی ارتقاء کی راہ پر رواں دواں ہو گئی جو شروع سے اس کا طریقہ کار تھا۔

لیکن ایک گروہ ابھی موجود تھا، جسے وحدت امت گوارا نہ تھی اور یہ سب فتنے اٹھائے تھے۔ صحابہ کرام اور بنی ہاشم آل بیت نبویؐ کے طریقہ اور عمل کے خلاف اس گروہ نے اپنا جھنڈا زیر زمین برقرار رکھا اور پھر عقائد و اعمال کے اعتبار سے ایک مستقل فرقہ بن گیا۔ اور اپنا نام شیعہ علی باقی رکھا۔ اسی گروہ میں سے خوارج پیدا ہوئے تھے۔ اور اسی گروہ کی پھر ذیلی شاخیں بنیں جو سب ایک دوسرے کی مذہب میں اور اپنے علاوہ دوسروں کو گمراہ و غلط روا اور باطل پرست کہتے ہیں۔

۱۔ اس گروہ کی حرکتیں اہل صفاء کو ناگوار تھیں، چنانچہ حضرت ابوالیوب انصاریؓ جنگ جمل تک حضرت علیؓ کے ساتھ تھے، پھر الگ ہو گئے اور صفین میں شریک نہیں ہوئے۔ ۲۔ ابوصحابہ فی تمیز الصحابہ بذیل عنوان خالد بن زیدؓ حضرت جریر بن عبد اللہؓ جنگ جمل کے بعد تک ساتھ رہے لیکن پھر بد دل ہو کر بدینہ طیبہ چلے گئے حضرت قیس بن سعد بن عبادہؓ صفین کے بعد تک ساتھ رہے اور مصر کے والی بنے لیکن سیاحتیہ کی ریشہ دوانیوں سے ناراض ہو کر الگ ہو گئے۔ اور مدینہ جا بیٹھے۔

جو شیعہ علیؑ اور شیعہ عثمانؓ ایک ہو گئے تھے اور اپنے یہ امتیازی نام
 چھوڑ دئے تھے، وہ اور جو گرد، عظیم غیر جانب دار تھا، اکھنڈ رہے باہم ربط
 مستحکم کر کے فرقوں کے مقابلوں میں اپنے آپ کو اہل سنت و اجماعت کہا
 اور یہی امت کا سواد اعظم ہے۔ اسی نے حضرت معاویہؓ کی بیعت کے سال کا
 نام عام الجہات رکھا۔ کیونکہ صحیح العقیدہ تمام امت ایک مرکز کے
 تحت منظم ہو گئی تھی۔ یہی سواد اعظم ہے۔ جو شرع سے آج تک سواد
 اعظم ہی چلا آرہا ہے، وحدت امت کا داعی ہے اور دعوتِ محمدیہ کا وادھ
 علمدار۔ مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ غیر مسلموں میں بھی امت کے اسی سواد
 اعظم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا بذاتہ تسلیم کیا جاتا ہے۔
 یہی مذہب حضرت علیؑ اور آپ کی صحیح النسب اولاد کا ہمیشہ رہا۔ انہیں
 سے بعض نے اپنی حکومت حاصل کرنے کی ناکام کوششیں توئیں، لیکن
 عقائد و اعمال اسلامیہ پر سب متفق رہے۔ ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ
 نہیں کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کا شرعی حق حضرت علیؑ اور
 ان کی اولاد کا ہے اور نہ کسی نے اپنے آپ کو معصوم کہا اور حجۃ اللہ جانا
 ان کا جم غفیر جو عملی سیاست سے کنارہ کش رہا مثلاً حضرت علی بن حسین
 (زین العابدین) ان کے فرزند محمد الباقر (ادب ان کے فرزند جعفر الصادق)
 یا دوسرے حسنی اور حسینی حضرات سب کے سب اپنے اپنے وقت کے خلفاء کی
 بیعت پر مستقیم رہے۔ اس نظام خلافت کو صحیح اسلامی نظام سمجھا اور
 کوئی کام ایسا نہ کیا جو سیاسی اختلال کا سبب بنے۔

ان میں زید یہ کے نام سے ایک فرقہ البیتہ بنا، ان کے اخلاف نے اپنی
 حکومت بھی قائم کی، لیکن ان کے ہاں بھی یہ امر عقائد میں ہے کہ حضرت علیؑ

کی خلافت کی کوئی شرعی دلیل نہ تھی اور خلفاء کرام کی خلافت حق تھی، البتہ یہ اکھنوں نے ضرور کہا کہ بنی صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتے کے سبب ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ خلافت پر فائز ہوں۔ اور یہ بات ایسی ہی ہے جیسے مختلف خاندانوں کے لوگ اپنی اپنی حکومت قائم کرنے کی تدبیریں کیا کرتے ہیں۔ حصول حکومت کو شرعی حیثیت سے عقیدہ بنانا یا کسی خاص شخص کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق خلیفہ مقرر ہونے کا تصور نہ زید کا تھا اور نہ کسی دوسرے علوی یا ہاشمی کا۔

ہاشمیوں کی سیاسی اور عمرانی واحد تحریک دعوت عباسیہ تھی لیکن اس دعوت کی بناء پوری طرح سیاسی اور عمرانی رکھی گئی۔ اس دعوت میں جو دنیا کی کامیاب ترین عوامی تحریکوں میں ہے اس تصور کا سہارا نہیں لیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمان الہی کے تحت آل عباس کو خلافت کا مستحق قرار دیا تھا۔ اور اس دینی بنیاد پر وہ کھڑے ہوئے ہیں، خاندانی ثروت اور افضلیت کا بیشک ذکر ہوا۔ مگر سبائیکہ کے مقابلے میں جو حضرت علی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث اور جانشین کہتے تھے اور اسے فرمان الہی بتاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں کہا گیا کہ حجاب کی موجودگی میں حجاب کا بیٹا کیسے وارث ہو سکتا ہے لیکن عوام کے سامنے جو اصول بتایا گیا وہ یہ تھا کہ خلافت اسلام میں عربوں اور غیر عربوں سب کی نمائندگی ہوتی تھی۔ امیر المومنین ہارون الرشید نے جو اپنے وقت کے سردار بنی ہاشم اور نمائندہ اہل اسلام تھے انھوں نے شاہ روم کو جو نصرانی دین کا نمائندہ تھا ایک مبسوط تبلیغی مراسلہ بھیجا، اس میں منقولی اور معقولی دلائل کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منقولہ دنیوی سے بے تیاری کے ثبوت میں بتایا گیا ہے کہ اپنے خاندان کے

سیاسی تفوق کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی حالانکہ کرتے تو اسکی پذیرائی کیجاتی
 فرماتے ہیں۔ رخصر المامون، طبع ۱۹۲۷ء دارالکتب مصریہ طبع ثانی رسالہ
 ابی الریح محمد بن ثابت (۱)

لعمرا للہ لو اسراد الملک لا قاز
 واراد طلب السلطان لذوی
 رحمة لو کذا لہم عقد الا
 یحل ولا یدرم لہما امر الا
 ینقص ولا تل لہم فی
 عفوان امرک ملک لا یخرج
 من ایدیہم ولا یدرج ابدا
 فیہم۔

بچہ اگر وہ در حضور صلی اللہ علیہ وسلم
 اپنے رشتہ داروں کی حکومت چاہتے
 اور عزیزوں کی حکومت کے خواہشمند
 ہوتے تو تاکید کے ساتھ عہد کو الیا
 پختہ کر دیتے کہ اسے توڑا نہ جاسکتا
 اور بات کو ایسی مضبوط کر دیتے کہ مالی
 نہ جاسکتی اور ابتداء خراب ہی ہیں
 انکی حکومت کی جڑیں ایسی گہری کر جاتی

کہ وہ ان کے ہاتھ سے نہ نکلتی اور ہمیشہ انہی میں رہتی۔
 کیا یہ پیمان اس بارے میں شافی نہیں کہ بنو ہاشم اپنی حکومت کو خدات
 کے شرعی فرمان کے تحت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اسے انسانی کوششوں پر مبنی
 رکھا اور اسی اعتبار سے کامیابی یا ناکامی ہوئی۔ جس کی کوشش تعمیری
 انداز میں رائے عامہ کو اپنے حق میں استوار کرنے پر مرکوز رہی اسے کامرانی
 نصیب ہوئی اور جو صحیح بنیاد پر کھڑے نہ ہوئے انسی قلبیوں ہی پر جن کے
 پر پیگندے کا دار و مدار رہا وہ ناکام رہے۔

چنانچہ محمد الارقط بن عبد اللہ حسنی، اور ان کے بھائی ابراہیم یا ایسے
 ہی دوسرے وہ علوی جو وقتاً فوقتاً خلقائے اسلام کے خلاف بغاوتیں
 اور خروج کرتے رہے، ان سب کی کوششیں انسانی اور سیاسی تھیں حکیم

الہی اور فرمان نبوی کا سہارا کسی نے نہیں لیا۔ اور نہ اپنے آپ کو معصوم
 ان میں سے بعض نے جو مظالم ڈھائے اور اخلاقی جرائم کا ارتکاب کیا
 امت سے اعلانیہ غداری کی تو اس پر معصومیت کا پردہ کسی نے نہ ڈھا
 زید یہ کہ ایک بہت بڑے عالم محمد بن الحسن دلمی نے اپنی کتاب
 قواعد عقائد آل محمد لکھی اس میں، اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ
 مذہب کا بطلان، سالوں کے بارے میں ان کا ہلک غلو اور حضرات
 صحابہ کرامؓ کو راہ حق سے ہٹا ہوا سمجھنا بیان کر کے بتایا ہے کہ زید یہ
 نزدیک یہ کفر محض ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس کتاب کی ابتدا ان کلمات
 کرتے ہیں۔ (مطبقة السعادة مصر ۱۹۵۵ء) یہ کتاب امام نجفی حمید الدین
 ہاں مخطوط کے صورت میں تھی۔ اب اسے شائع کیا گیا ہے)

بسم الله الرحمن الرحيم
 قبل الاشتغال ببيان مذہب
 الباطنية من كل طرف من
 مذہب الخلافة والمفوضة لا
 منهم ايضا. وذلك لان اصول
 مذہب الخلافة والمفوضة و
 الباطنية من الاسما عيلية
 والامامية الاثنا عشرية
 تختلط بعضها ببعض في كثير
 من المسائل ولذلك قبل
 الامامية دهلitz الباطنية

باطنیوں کا مذہب بیان کرتے سے پہلے
 غالیوں اور مفوضوں کی بعض باتیں
 بیان کرنی چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ
 بھی انہی میں ہیں، وجہ یہ ہے کہ غالی
 ہوں یا مفوض، اسماعیلی یا طنی ہوں
 یا اثنا عشری امامی، ان سب کے مذہبی
 اصول بہت سے مسائل میں ایک
 دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اسی لئے
 کہا گیا ہے کہ امامیہ کا مذہب باطنی
 مذہب کی دہلیز ہے۔ الہی کے ذریعے

لان الكل دخل في الشيعة
 من جتهنهم و كلهم يداعون
 التشيع و يغفلون في الدين
 و يخرجون من طريق المسلمين
 پھر آگے چل کر ص ۱۰۵ پر

منها انهم يكفرون الامة
المسلمة باجمعها ويسمونهم الامة
المنكوسة اي عن رشدها
ويسمون الائمة والعلماء
والفضلاء من لدن النبي
صلى الله عليه وسلم الى
يومنا الطواغيت والاصنام...
فاول صنم من اصنام
الطاغوتية ابوبكر ثم عمر ثم
عثمان ومن كان مثلهم في
كل وقت وزمان...
وهل هذا الا كفر صراح
وشرك محض؟

لوگ شیعیت میں داخل ہوتے ہیں
اور سب کے سب تشیع کے مدعی
ہو کر دین میں غلو کرتے ہیں۔ اور
مسلمانوں کے طریق سے نکل جاتے ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ یہ تمام امت مسلمہ کو
کافروں کی جماعت کہتے ہیں اور ان کا
نام انھوں نے امت سبزگوں رکھا ہے
یعنی راہِ راست چھوڑ دینے والی امت
پھر یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد
لیکرا آج تک کے تمام ائمہ علماء اور
فضلاء امت کو شیاطین اور اہنام
کہتے ہیں.... ران کے نزدیک شیطانی
بتوں میں پہلے بت ابوبکر ہیں پھر عمر اور
پھر عثمان اور انہیں کی طرح کے دوسرے
وہ سب حضرات جو کبھی اور کہیں پیدا
ہوئے ہوں..... کیا یہ تصور مزاح
کفر اور شرک محض نہیں ہے؟

مفوضہ اور غالیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا

ان الله تعالى قَوَّضَ امر العالم
الى الائمة الى على والحسن و
الحسين عليهم السلام ويا
الائمة من بعدهم وهم يخلقون
وليرزقون ويميتون و
يحْيون ويبعثون ويعاقبون
ويثيبون۔

اللہ تعالیٰ نے کار جہاں ائمہ کے سپرد
کر رکھا ہے یعنی حضرت علی حضرت
حضرت حسین علیہم السلام اور ان
بعد آنے والے باقی اماموں کے یہ
لوگ پیدا کرتے ہیں، روزی دیتے ہیں
مارتے ہیں جلاتے ہیں مرتے کے بعد
اٹھاتے ہیں عذاب دیتے ہیں اور جزا
دیتے ہیں۔

امامیہ اثنا عشریہ اگرچہ اتنا تو نہیں کہتے مگر ان کے ہاں یہ عقیدہ عام ہے کہ
جب حضرت علیؑ کو پکارا جاتا ہے تو وہ مدد کو آتے ہیں۔ اسی لئے ”یا علی“ کا نام
اور مصیبت کے وقت انھیں پکارنے کا طریقہ ان کے ہاں رائج ہے اور تا دغلا
ان کے ہاں کا مشہور و مقبول وظیفہ ہے۔ ساتھ ہی صحابہ کرام، اہل بیت
اور خلفاء اسلام پر لعنت ان کے ہاں عبادت کا درجہ رکھتی ہے شعبان کی پندرہ
شب آل ابی سفیان اور آل مردان رضی اللہ عنہم پر لعنت کرنے کے لئے ان کے
خاص ہے اور اسے بڑا ضرور وظیفہ سمجھا جاتا ہے۔

بقیہ ص ۱۵۵) الاذان میں مزاحمتاً بیان کیا ہے کہ مفوضہ ہی ہیں جو اذان میں حضرت علی
کے ولی اللہ اور وہی رسول اللہ اور خلیفہ بلا فصل ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں
کہ یہ الفاظ جزا اذان نہیں ہیں جو ان الفاظ کو جزا اذان سمجھ کر اس کو اذان
وقت کہے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

لے غیر شیعہ جہلاً بھی شیعہ پر ویگنڈے سے یہ لغزہ لگا بیٹھتے ہیں۔

صحیح النسب علویین کے بعض طبقوں میں شیعہ تصوات، خاندانی تعلی
رائشی بزرگی اور اپنے بزرگوں کی جناب میں غلو کا رواج اس وقت پورا جب مشرق
مجموعی الاصل یوہی رواقن اپنا سیاسی اقتدار قائم کرتے ہیں کامیاب ہو گئے
حایہ کرام پر لعن و طعن کا سلسلہ شروع ہوا۔ ماتم حسینؑ اور عبید غزیر کا اہتمام سرکاری
وزیر کیا گیا اور حضرت علیؑ اور ان کی اولاد سے غیر معتدل عقیدت کا اظہار کیا
نے لگا۔ تاریخ کی چھوٹی بڑی ہر معتبر کتاب سے ثابت ہے کہ ان تمام یدعات
سیئات کی ابتداء امیر الامراء معز الدولة اور اس کے یوہی خاندان نے کی، اس سے
ہے مسلمانوں میں ایسا کوئی تصور اور کوئی رواج نہ تھا۔ چنانچہ علامہ خفہ
محاضرات تاریخ الاحم الاسلامیہ میں الدولة العباسیہ کے تحت ص ۳۸
پر کتب تاریخ کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے۔

یوہی حکومت کے قیام سے پہلے اہل بغداد
سب اہل سنت و الجماعہ کے مذہب پر
تھے، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو
سب صحابہ سے افضل سمجھتے تھے اور حضرت
معاویہؓ یا مسلمانوں کے دوسرے بزرگوں
میں سے کسی پر طعن نہیں کرتے تھے لیکن
جب یہ حکومت قائم ہوئی جو غالی شیعہ
حکومت تھی تو بغداد میں مذہب شیعہ کو
فروغ ہوا۔ اور حکومت کی پشت پناہی
سے اسے قوت ملی۔ چنانچہ ۳۵۱ھ
میں بغداد کی مسجدوں میں جو عبادت

قدکات اہل بغداد قبل لدو
لیوکیہ علی مذہب اہل
لسنة والجماعة ویفضلون
لشیخین ابی بکر و عمر علی
سائرهم ولا یقدحون فی معاو
لا غیر من سلف المسلمین۔
فلما جاءت هذه الدولة
وهی متشیعة غالبة تمامت
الشیعة ببغداد ووجدوا
من قوة الحكومة الضاراً
فقد کتب علی مساجد بغداد

لَعْنَةُ مَا صَوَّرَتْهُ
 "لَعْنُ اللَّهِ مُعَاوِيَةَ بْنَ أَبِي سَفْيَانَ
 وَلَعْنُ مَنْ غَضِبَ فَاطِمَةَ قَدْ كَانَا
 وَمَنْ مَنَعَ أَنْ يَدْفِنَ الْحَسَنَ
 عِنْدَ قَبْرِ جَدِّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ
 وَمَنْ نَفَى أَبَا ذَرٍّ الْغَفَّارِي وَمَنْ
 أَخْرَجَ الْعَبَّاسَ عَنِ الشُّوْرَاءِ
 وَالْخَلِيفَةُ كَانَ مُحْكُومًا لَا يَقْدَرُ
 عَلَى الْمَنْعِ وَأَمَّا مَعْنَى الدَّوْلَةِ
 قِيَامُهُ كَانَ ذَلِكَ فَلَمَّا كَانَ
 اللَّيْلُ حَكَ بَعْضُ النَّاسِ قَارَادَ
 مَعَزَ الدَّوْلَةِ عَادَتْ قَاسِيَا
 عَلَيْهِ وَزِيرُهُ أَبُو مُحَمَّدٍ الْمُهَلَّبِيُّ
 بَانَ يَكْتُبُ مَكَانَهُ مَا يَجِبُ
 "لَعْنُ اللَّهِ الظَّالِمِينَ لَالِ
 رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
 وَسَلَّمَ وَلَا يَذْكُرُ أَحَدًا فِي لَعْنِ
 الْأَمْعَاوِيَّةِ"

تے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد پر ظلم کیا۔ اور اس لعنت میں تاہم کسی کا
 نہ لے سوائے معاویہ کے،

یہ لعنت حضرت صدیق اکبر پر تھی۔ جن پر یہ افتراء کیا گیا ہے کہ انھوں نے

لکھی گئی اس کی صورت یہ تھی۔

ہذا تعالیٰ معاویہ بن ابی سفیان کو اپنی
 رحمت سے دور کرے، اور اس پر بھی
 لعنت کرے جس نے فاطمہ سے نذر
 چھین لیا اور جس نے حسن کو ان کی نافرمانی
 علیہ السلام کے پاس دفن نہ ہونے
 دیا، اور اس پر جس نے ابوذر کو شہر بدر
 اور اس پر جس نے عباس کو شوری میں
 شامل نہیں کیا۔

خلیفہ وقت محکوم تھے اور انہیں اس
 روکنے کی قدرت نہ تھی یہ سب کام
 معز الدولہ کے حکم سے ہوا تھا۔ جب
 رات ہو گئی تو بعض لوگوں نے یہ عبارت
 مٹادی۔ معز الدولہ نے چاہا کہ دوبارہ
 لکھوائے لیکن اس کے وزیر ابو محمد
 المہلبی نے مشورہ دیا کہ اس کی بجائے
 حسب ذیل عبارت لکھوادے۔

"ہذا ان ظالموں پر لعنت کرے جنہوں نے

اس

ظلم

الغیر

میدہ فاطمہؓ کو قذک سے محروم کر دیا۔ پھر یہ لعنت حضرت مروانؓ پر ہے جن پر یہ
نتان رکھا گیا ہے کہ انھوں نے حضرت حسنؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دین
میں ہونے دیا۔ حضرت ابو ذرؓ کو شہر بدر کرنے کا جھوٹ حضرت عثمانؓ پر پولا گیا
ہے، اور حضرت عباسؓ کو شوری میں شامل نہ کرنے کا الزام حضرت فاروق
نظمؓ پر ہے۔

یوہی امیر الامرار کی حکومت خبیثہ کا جب خاتمہ ہو گیا تو خلفاء عباسیہ
مستقل طور پر یہ عبارت لکھوادی۔ مساجد بغداد کے منبروں پر۔
لا ان خیر الناس بعد رسول
یہ جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
نہ صلی اللہ علیہ وسلم
بو بکر ثم عمر ثم عثمان ثم
علی ثم معاویہ تا خال المسلمین
صی اللہ عنہم اجمعین
یہ جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
سلم کے بعد ان لوگوں میں سے بہتر
ابوبکر ہیں پھر عمر پھر عثمان پھر علی
پھر معاویہ یہ مسلمانوں کے ماموں
اللہ ان سب سے راضی ہو۔

قاضی ابوبکر ابن عربیؒ نے چھٹی صدی ہجری میں بغداد کی مسجدوں میں یہ
بجارت لکھی ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ یہ رد عمل تھا ابویہ زندقہ و احاد
ماورنہ مسجدوں میں ایسی عبارت لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اہل ایمان
و اپنے تمام بزرگوں کا یکساں احترام کرتے ہی چلے آ رہے ہیں اور صحابہ کرام
کے ساتھ جو عقیدت مسلمانوں کو ہے وہ دنیا میں دوسرے مذاہب کی لوگ
اپنے اسلاف کے ساتھ کب رکھتے ہیں۔

یہی حال ان عبیدی ملاحدہ کا تھا جنھوں نے ادعائے فاطمیت کے
ساتھ مصر میں حکومت قائم کی۔ ان کے متعلق تمام علماء تاریخ متفق ہیں کہ
(تاریخ الخلفاء ص ۵ طبع مصر)

اکثرهم زنادقة خارجون عن
الاسلام ومنهم من اظهر
سب الانبياء ومنهم من
اباح الخمر ومنهم من امر
بالسجود له والخير منهم
رافضی خبیث لئیم یا هر
یسب الصحابة رضی الله
عنهم۔

قال القاضي ابوبکر الباقلائی
کان المهدی عید الله
باطنیاً خبیثاً حریصاً علی
ازالة ملة الاسلام اعداء
العلماء والفقهاء لیتمکن من
اغواء الخلق وجاء اولاده
علی اسلوب اباح الخمر
والفروج وانشاء الرقص
وقال الذہبی کان القائم بن
المهدی شراً من ابيه
زند یقام ملعوناً اظهر سب
الانبياء۔ وقال وکان العبد یؤذ
علی ملة الاسلام شراً من

ان میں اکثر زندیق ہیں اور اسلام سے
خارج، ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں
نے انبیاء علیہم السلام پر سب و شتم
کے بعض وہ ہیں جنہوں نے نشہ حلال
کر دیا، ان میں وہ بھی ہیں جس نے
اپنے آپ کو سجدہ کر دیا، اور ان میں
جو سب سے اچھا تھا۔ وہ رافضی
تھا۔ خبیث تھا، مردود تھا، اور
صی بہ پر لعنت کا حکم کرتا تھا۔
قاضی ابوبکر الباقلائی فرماتے ہیں مہدی
عبد اللہ باطنی تھا خبیث تھا اور ملت
اسلام کو مٹانے پر حریص تھا، اس کے
علماء و فقہاء کو شہید کیا تاکہ مخلوق
گمراہ کرنے کی طاقت اسے حاصل
ہو جائے اور اس کی اولاد اسی کے
طریقے پر علی اکھوں نے شراب نوشی
اور زنا کاری حلال کر دی اور رقص
کو فروغ دیا۔

امام ذہبی فرماتے ہیں قائم بن مہدی
اپنے باپ سے بھی برا تھا، زندیق تھا
ملعون تھا، انبیاء علیہم السلام پر

التنز

وقال ابو الحسن القايسى ان
الذين قتلهم عبدا الله و
بنوه من العلماء والعباد
الاف رجل ليردوهم عن
الترضى عن الصحابة فاخذوا
الموت -

گالیاں دیتا تھا۔ اور فرماتے ہیں، "ملت
اسلامیہ کیلئے عبیدی لوگ تاتاریوں
سے بھی زیادہ برے تھے۔"

ابو الحسن القايسى کہتے ہیں کہ عبید اللہ
نے علماء اور صلحاء میں سے جن حضرات
کو شہید کیا وہ چار ہزار تھے انھیں
وہ صحابہ کیلئے دعا کرنے سے روکنا چاہتا
تھا لیکن انھوں نے موت کو ترجیح دی

سلطان غازی صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں اس دولت خیز شاہ کا
خاتمہ ہوا۔ حسن بن صباح اسی دعوت کا داعی تھا، بے شمار علماء و فضلاء و
فقہاء کا خون اس کی گردن پر ہے۔

یوہیوں اور عبیدیوں میں اگرچہ سیاسی اور مذہبی چشمک تھی مگر جہاں
تک دین اسلام کو تباہ اور ملت اسلامیہ پر مصائب توڑنے کا مسئلہ ہے
تو یہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کی معاون تھیں یہ سب روئداد صفحات
تاریخ پر ثبت ہے۔ اور کسی تاویل کی اس بارے میں گنجائش نہیں۔

غرض یہ ہے کہ چوتھی صدی سے پہلے آل علیؑ میں ان عقائد کا شائبہ
بھی نہ تھا۔ جو عجمی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ قدمائے آل علیؑ کا ان عجیب تصور
سے بیزاری اور بیری ہونے کا عملی ثبوت یہ ہے کہ وہ آپس میں اپنے تعلقات
مستحکم رکھتے تھے اور خلافت قائمہ یعنی اموی اور عباسی خلفائے کے ساتھ
بھی ان کے روابط شریعت کے مطابق قائم تھے۔ لیکن ان کی طرف منسوب
ہونے والے عجیب فرقوں نے انھیں آپس میں بانٹ رکھا ہے۔ ہر فرقے کی

امامت کا سلسلہ الگ ہے اور سب کے سب اپنے اپنے اممہ کو اپنی صفات سے
 متصف سمجھتے ہیں جو شیعیت کے امتیازات ہیں، اور دوسرے سلسلے کے
 کو کاذب اور مدعی جانتے ہیں۔ اگر واقعی آل علی کو شیعہ تصورات سے کچھ
 دلچسپی ہوتی اور ان کے ہاں امامت عرفی کا کوئی سلسلہ ہوتا تو ہر سلسلہ
 امامت کے لوگ ایک دوسرے کے حریف ہوتے اور ان میں یگانگت
 نہ پائی جاتی۔ شخصی اور انسانی حیثیت سے دوستی دشمنی یا رفاقت و یگانگت
 اور بات ہے مگر دینی اعتبار سے دو متضاد نظریوں میں ہم آہنگی کا کوئی
 امکان نہیں۔ مثلاً یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک سلسلے میں علی بن حسین
 (زین العابدین) امام معصوم ہیں اور ان کا تقرر خدا کی طرف سے ہوا ہے اور
 دوسرے فرقے کے نزدیک یہی حیثیت ان کے چچا محمد بن علی بن ابی طالب (علی)
 (کحنفیہ) کی ہے۔ اسی طرح امامینہ اثنا عشریہ کے ہاں خدا کی طرف سے
 امامت موسیٰ بن جعفر الصادق کو ملی۔ اور اسماعیلیہ کے نزدیک ان کے
 بڑے بھائی اسماعیل بن جعفر کو۔ پھر اسی طرح ان کے اور بھی سلاسل ہیں
 جن میں سے کچھ ختم ہو گئے اور کچھ باقی ہیں۔ خدا کی طرف سے تقرر اگر ایک
 ہوا ہے تو یقیناً دوسرے کا نہیں ہوا۔ اسی لئے یہ ایک دوسرے کی تکفیر
 کرتے ہیں۔ اگر اسی تکفیر کا سلسلہ آل علی کے مابین بھی ہوتا تو نہ ان میں
 نہ باہمی تعظیم و تکریم و مودت ہوتی اور نہ رشتہ داری یعنی سارا علم الالہیہ
 اپنی کے ہاتھوں غارت ہو چکا ہوتا۔

امامینہ اثنا عشریہ کے ہاں بارہویں امام محمد بن حسنؑ ہیں جنکی متعلق کہ
 جاتا ہے کہ بارہ سو برس سے غار میں چھپے بیٹھے ہیں اپنی سلسلہ امامت ختم
 ہو گیا۔ لیکن اسماعیلیہ کے ہاں امامت جاری ہے اور موجودہ کریم آغا خان

ان کے ایک فرقے کے نزدیک امام عصر ہیں اور ان تمام صفات سے موصوف
جوابل تشیع کے سب فرقوں کے نزدیک امام ہیں ہوتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ یا امت مسلمہ کے دوسرے ائمہ کرام میں سے کسی کو اس قسم کے
تصورات سے کیا علاقہ ہو سکتا تھا اور امامت کا یہ تصور ان کے نزدیک کسی
درجے میں کب درست سمجھا جاسکتا تھا۔ جب کہ سب کے ہاں کتاب اللہ، سنت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر مدار کا رہا ہے
امام اعظمؒ تو شیعی تصورات رکھنے والوں سے اتنے بیزار تھے کہ انکی روایت
قبول کرتے کے بھی روادار نہیں۔ چنانچہ خطیب بغدادیؒ نے الکفایہ فی علم
الروایۃ میں اپنی سند سے عبد اللہ بن المبارکؒ کے حوالے سے بیان کیا ہے
(ص ۱۲۶ مکتبہ السلفیہ، شیش محل لاہور)

سأل ابو عصمة ايا حنیفة
عن تأمر فی ان اسمع الآثار
قال من كل عدل فی هواه
الا الشیعة۔ قال فاصل
مذہبهم تضلیل اصحاب
محمد صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم۔

ابو عصمتؒ نے ابو حنیفہؒ سے دریافت
آپ مجھے کن لوگوں سے روایت لینے کا
حکم فرماتے ہیں؟ فرمایا ”ہر معتبر ثقہ
شخص سے اگرچہ وہ عقائد میں عجت
سے ہٹا ہوا ہو۔ سوائے شیعہ کے“
پھر فرمایا ”ان کا رشیعہ کا اصل
عقیدہ یہ ہے کہ اصحاب محمد صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کو کم راہ ثابت کریں

پھر یہی خطیبؒ ص ۱۲۵ - ۱۲۶ پر فرماتے ہیں

ہم نے پہلے ابو عبد اللہ الشافعیؒ (الامام)
کی یہ بات بیان کی ہے کہ ہوا پرست

قد اسلفنا الحکایۃ عن ابی
عبد اللہ الشافعیؒ فی جوابہ

قبول شہادۃ اہل الاہواء
غیر صنف من الرافضة خاصۃ
و یحکی ذلک عن ابی حنیفۃ
امام اصحاب الراۃ و ابی
یوسف القاضی۔

لوگوں کی روایت قبول کی جاسکتی ہے
سوائے رافضیوں کے خاص طبقہ
یہی بات امام اصحاب الراۃ ابی حنیفہ
سے نقل کی گئی ہے اور قاضی ابی یوسف
سے۔

امام اعظمؒ کی پہلی ملاقات جب حضرت عطاء بن ابی رباحؒ سے ہوئی
اور طلب علم کے لئے آپؒ نے ان کی خدمت میں رہنا چاہا، تو اس کا حال ابن
بطلانؒ نے شرح بخاری میں اس طرح لکھا ہے (تفسیر المتاریج ص ۲۱۵)
طبع مصر

ابو حنیفہؒ سے مروی ہے وہ فرماتے
میں نے مکہ میں عطاء بن ابی رباحؒ
سے ملاقات کی اور ان سے کچھ سوال
کئے انہوں نے پوچھا ”تم کہاں کی
میں نے عرض کیا ”کوٹہ کا“ فرمایا
تم اس سب سے ہوجہاں کے لوگوں
دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ
گروہ بن گئے؟“ میں نے کہا ”جی
فرمایا ”ان میں سے کسی گروہ سے تمہارا
تعلق ہے؟“ میں نے عرض کیا ”جی“
سے جو بزرگان سلف کی جناب میں
بے ادبی نہیں کرتے، تقدیر پر ایمان

عن ابی حنیفۃ انه قال لقیت
عطاء بن ابی رباح بمکہ
فسألتہ عن شیء فقال من
این انت؟ قلت من اهل
الکووفۃ قال انت من اهل
القریۃ الذی فرقوا دینہم
وکانوا شیعاء؟ فقلت نعم
قال من ای الاصناف انت؟
قلت من لا یست السلف
ویؤمن بالقدر ولا یکفر
بخدا بدنب؟ فقال عطاء
عرفت فالزم

رکھتے ہیں۔ اور گناہ کے سبب کسی کو کافر نہیں کہتے۔ فرمایا: تمہیں دین کا عرفان ہے۔ اسی پر جتنے رہو۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ اپنے مشائخ کرام کے طریقے پر امام صاحب کا شروع سے یہ مذہب تھا کہ سب صحابہ کرام کی تعظیم کریں، ان کے اختلافات میں فریق نہ بنیں تقدیر پر ایمان رکھیں اور معاصی پر کسی کی تکفیر نہ کریں۔ یعنی نہ رافضی ہوں اور نہ منکرین قدر ہوں اور نہ خوارج۔ بلکہ پوری طرح جماعت سے وابستہ رہیں اور سنت کا اتباع کریں۔ یہی امت کے سوادِ عظیم کا مسلک ہے اور اسی سوادِ عظیم کے عظیم ترین ائمہ میں امام اعظم ابو حنیفہؒ ہیں۔ ان کی اس سے بڑی کوئی ہتک نہیں ہو سکتی کہ انھیں کسی فرقے سے منسوب کیا جائے یا خلفاء اسلام سے بے تعلق بتایا جائے۔ یا جمل و صفین جیسے سیاسی جھگڑوں میں کسی کو اچھا برا کہنے والا سمجھا جائے یا ان کی ہمدردیاں ایسے لوگوں کے ساتھ بتائی جائیں جنھوں نے امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہا۔ اور اپنے عہد کے متفق علیہ خلیفہ کے خلاف بغاوت کی۔ امام اعظمؒ کے سامنے ان کے شیخ اکبر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا عمل تھا۔ جو جمل و صفین کے معاملات میں غیر جانبدار رہے اور افتراق امت کو پسند نہ کیا۔ اسی لئے انھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی، کیونکہ جماعت المسلمین اور امت کے سوادِ اعظم نے ان کی خلافت پر اجماع نہیں کیا تھا۔ اور اسی طرح انھوں نے ابن الزبیرؓ سے بھی بیعت نہیں کی لیکن امیر المؤمنین معاویہؓ امیر المؤمنین یزیدؓ امیر المؤمنین عبدالملکؓ اور امیر المؤمنین الولیدؓ سے بیعت کی۔ اپنے تابعی شاگرد امیر المؤمنین عبدالملکؓ سے اپنے بیعت جن الفاظ میں تحریر کے ذریعہ کی وہ موطار امام مالکؒ اور صحیح بخاری میں مذکور ہے صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۲۵ باب کیف یبایع الامام الناس

الى عبد الله عبد الملك امير
المؤمنين اتى اقربا السمع و
الطاعة لعبد الله عبد الملك
امير المؤمنين على سنة الله
وسنة رسوله فيما استطعت
وان بنى قدا قريذا لك-

بجناب بندہ خدا عبد الملك امير المؤمنين
میں اللہ کی مقرر کردہ سنت اور اس
رسول کی سنت پر اللہ کے بند عبد الملك
امير المؤمنين کا فرمان سنتے اور اسے
حتی المقدور بجا لانے کا اقرار کرتا ہوں
ایسا ہی اقرار میرے فرزندوں نے بھی
کیا ہے۔

پھر انام ابو حنیفہ کے سامنے اپنے دوسرے شیخ اعظم حضرت عبد اللہ بن عباس
کا بھی یہ عمل تھا کہ وہ اگرچہ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے ہر طرح ان کی مدد کی مگر
اکھنوں نے بیعت سے لے کر صفین کے معرکے تک بار بار اکھنوں کو روکنے کی کوشش
کی اور ان اقدامات کے خطرات سے آگاہ کیا۔ اور اس ٹولی سے محترز رہنے کی
تلقین کی جس نے اس امت میں سارا فساد کھڑا کیا تھا، لیکن یوحہ چھوٹے
بھائی ہونے کے ساتھ چھوڑنے کی جرأت نہ کی۔ ورنہ حقیقی ہدایات ان کے
وہی تھے جو ان کے سب سے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ کے تھے۔ اسی لئے
اکھنوں نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہؓ کو خط بھیج دیا تھا
کہ ہم اب اختلاف ختم کر کے آپ سے صلح اور بیعت کے لئے تیار ہیں۔ عجیب
کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو جو صلح اور بیعت کی دعوت دی صحیح بخاری
کتاب الصلح) وہ حضرات ابن عباسؓ کے اسی مراسلے کے سبب ہو۔ حضرت حسنؓ
اور حضرت معاویہؓ کے مابین حضرت ابن عباسؓ نے صلح نامہ مرتب کر کے بحیثیت
گواہ اپنے دستخط کئے تھے۔ پھر اکھنوں نے امیر المؤمنین یزیدؓ کی ولایت عہد

لہ دار المصنفین اعظم گڑھ نے کام تو بہت کیا مگر تاریخی اعتبار سے باقی ص ۱۶۷

اور خلافت کی بیعت کی اور اس پر مستقیم رہے۔ حرہ کے ہنگامے سے بنو ہاشم کو الگ رکھا۔ ابن الزبیر سے بیعت نہیں کی اور آپ ہی کے فرمان پر بنو ہاشم سب کے سب امیر المؤمنین عبدالملک کی بیعت میں داخل ہو گئے۔ حضرت ابن عباسؓ کو اموی خلافت کے قیام کا انتظار تھا۔ اور وہ اس لگائے بیٹھے تھے کہ امیر المؤمنین عبدالملک کامیاب ہو جائیں گے جیسا کہ صحیح بخاری سے معلوم ہوتا ہے (ج ۲ کتاب التفسیر ص ۱۳۶ باب قولہ ثانی اثنتین اذہما فی العار) حضرت ابن عباسؓ نے یہ کہ

(بقیہ ص ۱۶۶) سچی اور غلط سے پڑ۔ حضرت ابن عباسؓ کے احوال میں کہا گیا ہے کہ صفین کے معرکوں میں وہ بڑی بہادری سے لڑے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ جبل میں ام المؤمنین صلوٰۃ اللہ علیہا کے خلافت معرکہ آرا ہوئے اور نہ صفین میں۔ وہ بصرے کے والی تھے اور شروع سے آخر تک رہے۔ میدان جنگ میں ان کے آنے کا موقع ہی کیا تھا۔ اسی طرح آل عباس میں سے کسی کا حقیقی جنگ میں شریک ہونا ثابت نہیں کیونکہ وہ سب مختلف علاقوں کی حکومت پر فائز تھے۔ البتہ یہ ہے کہ جنگ جبل میں جب باہمی صلح ہو گئی۔ تو حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابن عباسؓ نے بطور رضا من کے اصحاب جبل کے ہاں رات گزاری اور حضرت محمد بن طلحہؓ نے اصحاب جبل کی طرف سے لشکر تصوی میں (منہاج السنۃ، البدایہ والنہایہ نیز طبری) اسی طرح صفین کے بعد ثائشوں کا فیصلہ سننے کے لئے جو اجتماع ہوا تھا اس میں حضرت علیؓ کی طرف سے چار سو مسائروں کی قیادت حضرت ابن عباسؓ نے کی اور آپ ہی نے انھیں نماز پڑھاتے تھے پھر حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین صلح مرتب کرتے ہیں آپ نے شرکت کی، غرض ان جنگوں میں تعمیری موقف حضرت ابن عباسؓ ہی کا نظر آتا ہے اور آپ مسلمانوں کے مابین کشت و خون پسند نہیں کرتے تھے اور یہی موقف حضرت حسنؓ کا تھا، نیز حضرت محمد بن طلحہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ بن العاص کا۔

والله ان وصلوني وصلوني من
 قريب ان رلوني رلوني الكفاء
 كرام - فائز التويات والاسماء
 والحميدات يرید ابطنا من
 بنی اسد بنی توییت و بنی
 اسامہ و بنی اسد ان ابن
 ابی العاص بر سر میشی لقد مية
 یعنی عبد الملك بن مرثان
 واندالوی ذنبه یعنی ابن الزبیر

بخدا اگر رہنوامیہ) میرا ساتھ صلہ جی کریں
 تو یہ صلہ جی قریب ترین عزیزوں کی طرف سے
 ہوگی۔ اور اگر وہ میری پرورش کریں گی تو
 یہ پرورش ذی احترام ہم چشموں کی طرف سے
 ہوگی تو پھر میں توییات، اسامات اور
 حمیدت کو کیوں ترجیح دوں راہ کی مراد
 بنو توییت، بنو اسامہ اور بنو اسد کے تھے

اور یہ جو ابوالعاص کے فرزند ہیں مردانہ
 وار بڑھ رہے ہیں یعنی عبد الملك بن

مروان اور یہ جو صاحب ہیں اکھنوں نے اپنی دم سکیر رکھی ہے یعنی ابن الزبیر رض
 لیکن یہ فتح آپ کی زندگی میں اکھن حاصل نہ ہوئی۔ اسی لئے آپ نے

اپنے فرزندوں کو اپنی وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ سب شام چلے جائیں۔
 اور ابن الزبیر کی حکومت میں نہ رہیں۔ چنانچہ یہ حضرات چلے گئے۔ امام بن حجر

عسقلانی فرماتے ہیں۔ ریح الباری ج ۲ ص ۲۶۲) فلیحق علی بعید
 الملك فكان اثر الناس عنده۔ حضرت علی بن عبد اللہ بن عباس

امیر المؤمنین عبد الملك کے پاس چلے گئے اور وہ آپ کے ہاں نہایت درجہ
 مقرب تھے) اسی طرح حضرت محمد بن علی بن ابی طالب راہن اکھن فیہ) نے امیر

المؤمنین یزید سے دونوں بیعتیں کی تھیں۔ اہل مدینہ کی بغاوت میں شریک
 نہیں ہوئے۔ ابن الزبیر سے بیعت نہیں کی اور التوابون اور مختار ثقفی نے خون

حسین کا بدلہ لینے کے بہانے جو تحریکیں چلائی ان سے قطعاً بے تعلق رہے
 اور امیر المؤمنین عبد الملك سے بیعت کی۔ آپ کے بیعت نامے سے ان تمام

خرافات کی تکذیب ہو جاتی ہے جنھیں اس سلسلے میں تاریخ کو مستح کر دیوں گے
چھال ہے۔ آپ کا بیعت نامہ یہ تھا۔

بسم الله الرحمن الرحيم لعبد
الله عبد الملك امير المؤمنين

من محمد بن علي اما بعد فاني
لما رأيت الامة قد اختلفت
اعتزلتهم فلما افضى هذا

الامر اليك وبأيعك الناس
ورأيت الناس قد اجتمعوا

عليك كنت كرجل منهم
ادخل في صالح ما دخلوا

فيه فقد بايعتك وبأيعت
الحجاج لك وبعتت اليك

ببيعتي ونحن نحيا نؤمننا
وتعطينا ميثاقا على الوفاء

نامہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ہم کو محبوب ہے کہ آپ ہمیں امان دیں اور عہد پورا
کرتے کا ہم سے وعدہ کریں۔

امير المؤمنين عبد الملك تے اس بیعت نامے کے جواب میں لکھا۔
انك عندنا محمود۔ انت آت

واقرب الينا رحماً من ابن
الزبير فلك العهد الميثاق

آپ ہمارے نزدیک قابل ستائش
ہیں ابن الزبیر کے مقابلے میں نسباً
ہم سے قریب تر ہیں اور ہمیں محبوب

آپ ہمارے

بسم الله الرحمن الرحيم، بندہ خدا عبد
الملك امير المؤمنين کی خدمت میں منجانب

محمد بن علي۔ اما بعد میں نے جب دیکھا کہ
امت میں اختلاف پڑ گیا ہے تو ان

سب الگ ہو کر بیٹھ گیا، پھر جب
معاملہ آپ کے ہاتھ میں آیا لوگوں نے

آپ سے بیعت کر لی اور میں نے دیکھا
کہ سب آپ پر اجماع کر لیا تو میں بھی

اپنے آپ کو انہی میں کا ایک فرد سمجھا
اور جس نیک کام میں وہ شریک ہو گا

میں بھی شریک ہوتا ہوں میں نے آپ سے
بیعت کر لی ہے یعنی آپ کی بیعت

حجاج کے ہاتھ پر کر لی اور اپنا یہ بیعت
نامہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ہم کو محبوب ہے کہ آپ ہمیں امان دیں اور عہد پورا

کرتے کا ہم سے وعدہ کریں۔

امير المؤمنين عبد الملك تے اس بیعت نامے کے جواب میں لکھا۔
انك عندنا محمود۔ انت آت

واقرب الينا رحماً من ابن
الزبير فلك العهد الميثاق

آپ ہمارے نزدیک قابل ستائش
ہیں ابن الزبیر کے مقابلے میں نسباً
ہم سے قریب تر ہیں اور ہمیں محبوب

و ذمۃ اللہ ورسولہ ان لا
تھاج ولا احد من اصحابک
بشیء تکرہہ۔ ارجع الی
بلدک و اذهب حیث شئت
ولست ادع صلتک و عونک
ما حییت۔

جائیے۔ میں زندگی بھر آپ کی مدارات اور آپ کی امداد سے دریغ نہیں کر دے گا
و کتب الی الحجاج یا ہرک
بحسن جوارہ و اکرامہ فرجع
ابن الحنفیۃ الی المدینۃ و
ہا دارا و اقام بها۔

ہیں آپ کے ساتھ ہمارا عہد پیمان ہے
اللہ کا ذمہ ہے اور اس کے رسول کا
ہے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو
ایسی کوئی بات نہیں پہنچائی جائے گی
جو آپ کو ناگوار ہو۔ آپ اپنے شہر کو
واپس ہو جائے اور جب جی چاہے
جائیے۔ میں زندگی بھر آپ کی مدارات اور آپ کی امداد سے دریغ نہیں کر دے گا
پھر امیر حجج کو آپ نے ان کے
ساتھ خوش معاہدگی اور احترام کا
حکم نامہ بھیجا۔ چنانچہ جناب محمد بن
علی بن الحنفیہ مدینہ طیبہ واپس
ہوئے اور وہاں ایک گھر بنا کر مقیم
ہو گئے۔

امام ابو حنیفہؒ کو صحابہ کرام اور بنی ہاشم آل بیتؑ کا طرز عمل معلوم تھا
کہ اموی خلافت کے خلاف خروج کو وہ ناجائز سمجھتے تھے اور ان ہنگاموں سے
اکھوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی جو ابن الزبیرؓ کی حکومت قائم کرتے یا خون حسینؓ
کا بدلہ لینے کے نام سے جاری کی گئیں بلکہ ان تحریکوں سے اکھوں نے بیزاری
ظاہر کی۔ چہ ہو صحابہ اور آل بیتؑ اور اپنے دونوں عظیم شیخوں کے اس عمل
کی موجودگی میں ان کی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ کیسے ہو سکتی تھیں۔
جنہوں نے خلافت قائمہ کے خلاف خروج کیا۔ وہ حضرت ابن عمرؓ کے اس
ارشاد کو کیسے فراموش کر سکتے تھے۔ جو صحیح بخاری میں مذکور ہے ریح ۲

کتاب الفتن

وإني لا أعلم غدرًا أعظم من
ان تبایع رجلاً علی بیع الله
ورسوله ثم تنصب له
القتال -

مجھے اس سے بڑا کوئی غدر نظر نہیں
آتا کہ ہم اداں تو ایک شخص کے ہاتھ
پر خدا اور رسول کی بیعت کریں اور پھر
اس سے لڑنے کے لئے پرا جائیں۔

امیر المؤمنین یزید کے خلاف ابن الزبیرؓ کی حمایت میں اہل مدینہ نے جو
بغاوت کی اور حرہ کا افسوسناک اور تباہ کن حادثہ پیش آیا اس کے متعلق
البدایہ والنہایہ میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں (رج ۸، ص ۲۰۸)
واعتزل الناس علی بن حسین
وکن لك عبد الله بن عمر بن
الخطاب لم يجلعا یزید ولا
من بیت ابن عمر وکن لك لم
يجلعا یزیداً احد من بتی
عبد المطلب

گھرانے والوں نے، اسی طرح آل عبد المطلب (یعنی بنو ہاشم) میں سے بھی کسی نے
بیعت نہیں توڑی۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں (ص ۲۳۳)

وقد كان عبد الله بن عمر
بن الخطاب جماعة اهل
بیت النبوة ممن لم ينقص
العهد ولا يایع احدا بعد

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بن الخطاب اور
اہل بیت نبوت (یعنی بنی ہاشم) کے سب
لوگ انہیں میں جھوٹے عہد نہیں توڑا
اور امیر المؤمنین (یزید) سے بیعت

کرتے کے بعد ان کی زندگی میں کسی

بیعت نہیں کی اور ان کے بعد حضرت ابن الزبیر سے بھی بیعت نہیں کی

امام ابو حنیفہ کے یہ دونوں شیخ جواہر صحابہ میں ہیں ان کا عمل ان کے

سامنے تھا اور انہی کے نظریات کے تحت ان کی پرورش ہوئی تھی تو یہ کیسے

ممکن تھا کہ ان میں شیعیت کی کوئی رمت آسکے۔ علاوہ ازیں تابعین عظام

میں جو ان کے اساتذہ ہیں یعنی قاضی شریح (م ۸۸ھ) علقمہ (م ۶۲ھ) ۷۲ھ

مسروق بن الابدع (م ۶۲ھ) اور اسود ابن زید (م ۹۵ھ) جو خاص

حادثہ کربلا کے وقت کوفے میں موجود تھے۔ ان میں سے کسی نے جہور صحابہ

کرام کے موقف کے مطابق حضرت حسینؑ کے اقدام کی حمایت نہیں کی تا آنکہ

خود حضرت حسینؑ نے کوفے پہنچنے سے پہلے ہی جب وہاں کے حالات معلوم

کئے کہ عراق پوری طرح امیر المؤمنین یزیدؑ کی بیعت پر مجتمع ہے اور سیاحین

نے جو کچھ بیان کیا تھا وہ سب جھوٹ تھا تو آپ نے اپنے موقف سے جوع

کا اعلان کر دیا اور امیر المؤمنین یزیدؑ سے بیعت کرنے کے لئے کوفہ کی راہ سے

پلٹ کر براہ کربلا دمشق کی طرف چل پڑے۔ لیکن آپ کے ساتھ جو ساٹھ

سیاحی تھے۔ اور جو مکہ مکرمہ سے آپ کو سیر باغ دکھا کر اپنے ساتھ لائے تھے

ان کے سبب حادثہ کربلا رونما ہوا۔ اس حادثہ کی ذمہ داری ہم عصر امت نے

حکومت پر نہیں ڈالی یعنی نہ عمر بن سعدؓ نہ امیر عبید اللہؓ پر چہ جائیکہ وہ

امیر المؤمنین یزیدؑ کو اس کا ذمہ دار کھیراتے۔ حتیٰ کہ ابن الزبیرؓ نے امیر

المؤمنین کے خلاف جب بغاوت کروائی تو اکھنوں نے بھی ان کے معائب

و مظالم میں خون حسینؑ کا نام نہیں لیا۔ اور لیتے بھی کیسے جب اکھنیں صحیح صورت

معلوم ہوتی تھی اور وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس بغاوت میں کوئی ہاشمی شریک

نہیں ہو رہا۔ کیونکہ حضرت حسین کے آخری موقف کی پذیرائی میں وہ حضرات جو
 حادثہ کربلا کے بعد زندہ بچے تھے انھوں نے دمشق جا کر امیر المؤمنین یزید سے
 بیعت کر کے حضرت حسین کا منشا پورا کر دیا۔ اسی لئے وہ سب حضرات اپنی
 بیعت پر مستقیم رہے اور ابن الزبیر کی خاطر بیعت توڑنے پر تیار نہیں ہوئے
 اسی طرح امام عظیم کے اساتذہ کرام جو عہد مصطفوی میں موجود تھے
 انھوں نے صفین کی جنگ میں حصہ نہیں لیا اور غیر جانبدار رہے اسی
 طرح جو اساتذہ ان کے حادثہ کربلا کے وقت کوئے میں موجود تھے انھوں نے
 حضرت حسین کا ساتھ نہ دیا۔ اور ان کے خروج کو جائز نہ جانا۔ وہ مسلمانوں
 کے ان دو بڑے گروہوں کے اختلاف میں فریق بننے کے لئے تیار نہ تھے۔ حضرت
 علقمہؓ البتہ جنگ صفین میں شریک ہوئے اور ایک ٹانگ سے معذور رہ گئے
 مگر پھر سیاست میں عملاً کبھی حصہ نہیں لیا اور علمی مشاغل ہی سے سروکار
 رکھا۔ اسی لئے امیر المؤمنین یزید کی بیعت توڑ کر حضرت حسین کا ساتھ دینے
 سے بھی انھوں نے گریز کیا۔

ان حقائق تاریخیہ کی موجودگی میں وہ سب تصورات پادریہ ثابت
 ہوتے ہیں جو روایات و اہیہ کے ذریعہ امام ابوحنیفہؒ کو کسی درجہ کی شیعیت
 سے منہم کرتے کے لئے وضع کئے گئے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں اپنے مذہب
 کی تدوین میں خود امام صاحب کا عمل۔ امیر المؤمنین ابو جعفر المنصورؒ کا
 فرمان اور اس کا امام صاحب کی طرف سے جواب اور نقل کیا جا چکا ہے کہ
 آپ کے ہاں استخراج مسائل کا کیا طریقہ تھا اور یہ کہ قیاس کو حدیث پر آپ
 ہاں مقدم نہیں رکھا جاتا۔ یہی بات خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں
 امام صاحب کے طریقہ اجتہاد کی خود انکی زبانی اس طرح بیان کی ہے۔

”اول میں مسئلہ کتاب الشریعہ سے لیتا ہوں۔ اس میں نہ ملے تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتا ہوں۔ اگر دونوں میں نہ ملے تو پھر آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے اقوال دیکھتا ہوں ان میں سے جس کا قول چاہتا ہوں۔ چھوڑ دیتا ہوں لیکن ان کے اقوال سے یا ہر نہیں جاتا۔ پھر بات اگر ابراہیم و شعبی پر آپڑے یا ابن سیرین، حسن بصری، عطاء، سعید بن المسیب پر اور ایسے ہی آپ نے دوسرے نام لئے تو پھر میں بھی اسی طرح اجتہاد کرتا ہوں جیسے ان حضرات نے کیا۔

اب سوچنا چاہئے کہ جو شخص اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے باہر جاتے پر تیار نہ ہو اور ان کے اجماع کو کتاب الشریعہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حجت شرعیہ جانتے وہ ان کے کسی اجماعی فیصلے کو یہ کیسے کہہ سکتا ہے۔ اموی خلافت صحابہ کرام کے اجماع سے قائم ہوئی تھی اور اس خلافت کے کارکنوں میں ہمیں صحابہ کرام کے اسماء گرامی امیر المؤمنین و لیڈ اول نمک ملتے ہیں اور عباسی خلافت تو قائم ہی ہوئی تھی تمام امت کے اجماع سے۔ ایسی صورت میں نہ آپ اس خلافت کی حجت پر شدید کر سکتے تھے۔ نہ امیر المؤمنین ابو جعفر المنصور کی اطاعت سے منہ موڑ سکتے تھے اور نہ ان خلافتوں کے خلاف کھڑے ہونے والے کسی شخص کا نظری یا عملی حیثیت سے ساتھ دے سکتے تھے۔

ان مولفوں اور مصنفوں کو سیاسی روایات اپنی کتابوں میں درج کر وقت غور کرنا چاہئے تھا کہ جس امام کا مذہب کتابی صورت میں خود اسکے اپنے شاگردوں کے ہاتھوں میں نہ رہا ہے اور تین چوتھائی امت جس مذہب

لی پابند ہے، اس امام کے بارے میں ایسی روایات کیسے قبول کی جاسکتی ہیں جو خود اس کے مذہب اس کے اساتذہ کے مذہب اور اس کے تلامذہ کے مذہب کے خلاف ہیں۔ یہ روایات اگر کسی درجے میں صحیح ہوں تو کیا مذہب متقی کو خلفاء اسلام کے ہاں سرکاری حیثیت حاصل ہو سکتی تھی؟ اور یہ امر مسلم ہے کہ خلافت عباسیہ کا نظام قانون فقہ حنفی پر قائم تھا یہی وجہ ہے کہ مصر کے عبیدی تلامذہ کی حکومت میں اہل السنۃ کے معاملات کے لئے شافعی اور مالکی قاضیوں کو تو مقرر کیا گیا۔ کسی حنفی المذہب کو وہاں قاضی بنانے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ عبیدیوں کے نزدیک وہ خلافت عباسیہ کا مذہب تھا۔

اختار وایت میں سختی۔ علماء حدیث میں بعض حضرات کے ہاں اہل ہوا و بدعت سے اختار وایت میں نرمی ہے اور بعض کے ہاں سختی۔ امام اعظمؒ ان میں ہیں جن کے ہاں اس بارے میں سختی ہو جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور خصوصیت کے ساتھ یہ سختی ان لوگوں کے حق میں زیادہ ہے جن میں تشیع پایا جاتا ہو۔ کیونکہ تشیع سے آدمی حمل و صغیر میں فریق بن جاتا ہے۔ اور حادثہ کربلا کو غیر معمولی اہمیت دیکر جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعین کی جناب میں سوء ظن کا ترکیب ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی صحابی نے بھی حضرت حسینؑ کے خروج کی حمایت نہیں کی اور سب صحابہ نے جو ان سے ملے انہیں اس اقدام سے روکا۔ تاآنکہ انہوں نے کوہ پہونچ کر اپنے موقف سے رجوع کر کے امیر المؤمنین یزیدؑ سے بیعت پر آمادگی کا اعلان کرتے ہوئے کوفے کے راستے سے پلٹ کر براہ کربلا دمشق جانے لگے تھے کہ ان کے ساتھ ساتھ کوفیوں کی غداری سے یہ سانحہ پیش آ گیا۔

گویا تشیع اپنے لوازمات کے ساتھ حضرت حسینؑ اور آپ کے فرزند ارجمند
دوسرے اعزہ و اقربا کے مواقف کے خلاف ایک تحریک ہے۔ اسے اول
التوابوں نے تین برس کی قاموشی کے بعد اختلال کے زمانے میں جاری کرنا
اور پھر مختار ثقفی نے، اور نام لیا۔ خون حسینؑ کے انتقام کا۔ لیکن نہ بنو ہاشم
ان تحریکوں سے کوئی دلچسپی لی اور نہ صحابہ کرام نے بلکہ سب ہم عصر امت
ان کے قائدین کو گمراہ جانا اور کذاب کہا۔ پھر تین سو برس تک اسلام
معاشرے میں اس حادثے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ سوائے اس دلی رنج اور صدمہ
کے جو ایسی قیمتی اور بے بہا جانیں ضائع ہوتے پر ہر مومن محسوس کرتا ہے
صرف اہل تشیع کے ہاں ذکر ہوتا ہوگا۔ جیسا کہ ابو مخنف کی تحریروں سے پتہ
چلتا ہے اور طبری وغیرہ اس کی خرافات نقل کر کے اپنی تاریخ کے اور ادوار
سیاہ کئے ہیں۔ مگر یہ بات کتابوں کی حد تک ہی۔ اسے اہمیت تو چوتھی صد
ہجری میں یوہی زواقض نے دی جیسا کہ پچھلے اوراق میں مذکور ہوا۔ اور
صفحات دہر پر ثبت ہے۔

اسی لئے اہل تشیع سے روایت لیتے ہیں امام اعظم کی جو سختی ہے
امام شافعی بھی شریک ہیں۔ جیسا کہ الکفایہ کے حوالے سے بیان ہوا
اب طبقات الشافعیۃ الکبریٰ سے یہ سختی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے
ص ۲۵۱، طبع مصر

اس انصاف کے بارے میں جو غنیمت
فی کی تقسیم کے وقت حاضر ہوا امام شافعی
فرماتے ہیں کہ اسے اس میں حصہ
اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت فی کی

قال لشافعی فی الراقضی حیض
الوقعة لا یعطى من الفی شیء
لان الله تعالی ذکر آية الفی
ثم قال والذین جاؤا من بعدہم

فمن لم يقل برہا لا یستحق قرایلم ہے۔ اور جو لوگ ان کے ربیعہ نہا جرین والصار کے بعد آئے کہتے ہیں رخدایا ہماری بھی پردہ پوشی فرما اور سہا کہ ان بھائیوں کی بھی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر گئے اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کی طرف سے کدورت مت رہنے دے۔ خدایا تو ہی ہے دلوں میں رافت و رحمت پیدا کرنے والا تو جو شخص یہ نہ کہے اسے رفتے میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں۔

الکفایہ فی علم الروایہ میں ہے (ص ۱۳۱) کہ حضرت عبداللہ الاخرم حافظ حدیث سے پوچھا گیا کہ امام بخاریؒ نے ابوالطقیل عامر بن واثلہ کی کوئی روایت کیوں نہیں لی تو فرمایا لانہ کان یقرط فی التشیع راس لئے کہ ان میں تشیع بہت زیادہ تھا یہ عامر بن واثلہ صغار صحابہ میں ابن الزبیرؓ اور امیر المؤمنین مروانؓ اول کے طبقے میں ہیں یصفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ اور پھر کوٹے میں رہ گئے تو ان میں تشیع آگیا۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابن الزبیرؓ اور حضرت مروانؓ کی روایات اور فتاویٰ صحیح میں درج کئے ہیں لیکن عامر بن واثلہ کی روایت لینے سے احتراز کیا حالانکہ انکا تشیع محض نظری تھا اور وہ اس لئے تیار نہیں ہوئے کہ قوا عد شرعیہ توڑ کر متفق علیہ امام کی بیعت نسخ کر دیں، وہ حادثہ کربلا کے وقت کوٹے میں موجود تھے اور خروج میں حضرت حسینؓ کا ساتھ نہیں دیا۔

مواقف اقربائے حسینؓ حادثہ کربلا کے عینی شاہد علی بن الحسینؓ (زین العابدینؓ) ابن نیران کے سگے بہنوئی اور ابن عم حسن بن الحسنؓ اور دوسرے ابن عم زید بن الحسنؓ اور تیسرے ابن عم عبداللہؓ ابن العباس بن علی بن ابی طالبؓ وغیرہم۔ ان کے علاوہ سیدہ زینب بنت علیؓ

تھیں جنہیں حضرت حسینؑ کا اس سفر میں ساتھ دینے کے سبب ان کے شوہر حضرت عبداللہ بن جعفر نے طلاق دیدی تھی یہ سب حضرات حبشہ دمشق گئے اور امیر المؤمنین یزیدؑ سے بیعت کر کے حضرت حسینؑ کے آخری موقف کی تکمیل کر دی تو اس بیعت پر ہمیشہ قائم رہے، امیر المؤمنین کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ انکی وفات کے بعد بھی ان کے وفادار رہے اور ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی۔

— امیر المؤمنین یزیدؑ حضرت عبداللہ بن جعفرؑ کے داماد تھے یعنی انکی دختر نیک اختر سیدہ ام محمد کے خاوند سیدہ زینب جو حادثہ کربلا کے سبب بہت بلول تھیں جب اس پیرہ سال میں کہ عمر باون برس تھی دمشق گئیں تو اپنے عظیم المرتبت داماد کے حسن سلوک اور یا اذب ملاطفت و مدارات سے اتنی متاثر ہوئیں کہ مدینہ طیبہ میں واپس ہونے کے بجائے وہیں رہ گئیں تاکہ انہیں وفات پائی۔ دمشق میں ان کا مزار مبارک زیارت گاہِ خلائق ہے۔

لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ سیدہ زینبؑ کے دونوں بچے عون اور محمد کربلا میں شہید ہوئے۔ اس سلسلے میں بہت دلدور افسانے اور مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ عون اور محمد سیدہ زینبؑ کے دیور کھے ان میں عون الاکبر حضرت علیؑ کے سگے بھتیجے بہوتے کے علاوہ آپ کے داماد بھی تھے، سیدہ ام کلثوم بنت علیؑ کے خاوند۔ انکی شہادت کے بعد سیدہ ام کلثوم کا نکاح ان کے ایک بھائی حضرت محمد جعفری کے ساتھ ہوا۔ جھقوں نے حضرت حسینؑ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ انکی وفات کے بعد وہ عبداللہ بن جعفر کے نکاح میں آئیں۔ کیونکہ وہ انکی بڑی ہمیشہ سیدہ زینب کو طلاق دے چکے تھے۔ سیدہ زینب کے ایک ہی فرزند تھے جناب علی جو الزینبی کہلاتے ہیں وہ اپنے والد ماجد کے حکم سے اپنی والدہ اور اپنے ماموں کا ساتھ دینے سے رکے رہے۔ کربلائی سفر میں ساتھ نہ گئے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ عون اور محمد کو حضرت عبداللہ بن جعفر کو بھائیوں
 اور حضرت حسینؑ کے چچا کے فرزندوں کی حیثیت سے نہیں رویا جاتا بلکہ کذباً و افتراءً
 سیدہ زینب کے کم سن فرزند بتا کر رویا جاتا ہے۔ گویا حضرت جعفر طیارؑ کے
 فرزند اس قابل نہیں کہ حضرت حسینؑ کے ساتھ شہید ہوتے کے باوجود ان کا نام کیا
 جائے۔ اسی طرح خود حضرت حسینؑ کے بھی دو بھائیوں کا نام کسی کی زبان پر
 نہیں آتا حالانکہ وہ بھی کربلاء میں شہید ہوئے تھے یعنی ابوبکر اور عثمان فرزدان
 حضرت علیؑ کا اس طرح تخریبی مقاصد کے تحت علم الانساب غارت کیا جاتا،
 بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ دمشق میں جن، سیدہ زینب کا مزار
 وہ بنت علی کہلاتی ہیں وہ ہیں تو بنت علی ہی مگر بنت احسن بن الحسن بن علی بن
 ابی طالب کی حیثیت سے جو امیر المؤمنین الولی الاول کی زوجہ محترمہ تھیں، اگر یہ
 ثابت ہو جائے تب بھی یہ اسکی دلیل ہے کہ حادثہ کربلاء کا کوئی اثر آل علیؑ کے لیا
 نہیں لیا جو انھیں اموی سادات سے برگشتہ کرے بلکہ انھوں نے یا بھی محبت
 و مودت برقرار رکھی۔ کیا اس کا یہ قطعی ثبوت نہیں کہ بنو ہاشم نے حادثہ کربلاء کی
 ذمہ داری امیر المؤمنین یزیدؑ اور ان کی حکومت پر نہیں ڈالی۔ یہ حسن بن الحسنؑ
 حادثہ کربلاء میں موجود تھے۔ جیسا کہ مذکور ہوا۔ اور وہاں کی ایک ایک بات
 ان کی آنکھوں دیکھی تھی۔ لیکن نہ تو یہ امیر المؤمنین یزیدؑ کے خلاف اہل بدعت کی
 بغاوت میں شامل ہوئے جو ابن الزبیرؑ کے داعیوں نے بپا کی تھی نہ انھوں نے
 التوابون اور مختار ثقفی سے کوئی تعلق رکھا جو اپنے تخریبی مقاصد کے تحت
 یکے بعد دیگرے خون حسینؑ کا بدلہ لینے کھڑے ہوئے تھے۔ اور نہ انھوں نے
 بعد میں ابن الزبیرؑ سے بیعت کی۔ کیونکہ وہ مرکز خلافت دمشق کو جانتے
 تھے۔ اور وہاں کے ارباب و عل و عقد نے ابن الزبیرؑ کو باغی قرار دیا تھا

پھر امیر المؤمنین عبدالملک کی بیعت میں داخل ہو گئے اور اپنی نور چشم کو انکی
 فرزند ارجمند ولید اول کے حوالہ عقد میں دیدیا۔ جو بعد میں دعوت محمدیہ کے
 عظیم ترین علمبردار اور امت محمدیہ کے یگانہ روزگار امام ثابت ہوئے
 حضرت حسینؑ کی شہادت سے جن حضرات کے دلوں پر سب سے زیادہ چوٹ
 پڑی، ان کا طرز عمل تو یہ تھا کہ امیر المؤمنین یزیدؑ کو اپنا امام تسلیم کرنے کے علاوہ
 اپنا شفیق بزرگ بھی جانتے تھے۔ لیکن ان کی محبت کا دم بھرنے والوں نے امیر المؤمنین
 کے خلاف وہ طوفان چھا رکھا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو اہل السنہ کہتے ہیں وہ بھی
 اکثر اس میں بہہ گئے۔ اس صورت حال کی زیادہ ذمہ داری ان مصنفوں پر ہے
 جنہوں نے وہابی روایتیں اپنی کتابوں میں بھر دیں اور اہل تشیع کی روایات
 لینے سے احتراز نہ کیا۔ پھر وہ مصنف ہیں جو تھے تو شیعہ مگر کہتے تھے اپنے آپ کو
 اہل تسنن، اور اس طرح اکھڑوں نے کام کیا مثلاً محمد بن جریر طبری جو اپنی تفسیر
 اور تاریخ کے سبب بڑا مقام رکھتے ہیں۔ اور بعد کے لوگوں نے ان کے علمی
 تبصرے کے سبب علماء اہل سنت میں سمجھ لیا۔ حالانکہ ہم عصر مسلمانوں نے انہیں
 اس کتاب میں سمجھا کہ مغایر مسلمین ہیں انھیں دفن کریں۔ وہ اپنے گھر
 میں مدفون ہوئے۔

اسی طرح ابو عبد اللہ الشافعی کا کم نیشاپوری بڑے محدث تھے اور اکابر علماء
 فقہار سے اکھڑوں نے فیض لیا۔ لیکن تھے شیعہ المشرّب۔ ان کی کتاب المستدرک
 اس پر شاہد ہے۔ ایسی ایسی روایات کو اکھڑوں نے اپنے مقاصد
 کے تحت بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے جن کی کچھ اصل نہیں، ویسے
 ان کی کتاب معروفہ علوم الحدیث بتدایہ ہے اور طلباء علم و حدیث کیلئے
 مفید۔ مگر اس میں اکھڑوں نے یہ ہتھام کیا ہے کہ امیر المؤمنین میں زبہ کا اٹھنا

گرا می نہ آتے پائے۔ ان کا رفعت خلفاء ثلاثہ کے بارے میں تہ تھا۔ کیونکہ ان کے ساتھ اکھوں نے بڑی عقیدت ظاہر کی ہے۔ البتہ اموی قائلو ادے سے نفرت کے ذریعہ اکھوں نے اپنا کام چلا یا ہے۔ حالانکہ اس عہد کے مسلمان اہل تسنن میں اکھیں سمجھتے تھے جو حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی وہی عقیدت رکھیں جو خلفاء ثلاثہ کے ساتھ ہو۔ چنانچہ محمد بن ابی طاہران کے بارے میں فرماتے ہیں۔

الطیقات الشافعیۃ الکبریٰ، ج ۳، ص ۶۸ طبع مصر

انہ کان شد ید التعصب
فی الباطن وکان یظہر التسنن
فی التقذیم والخلافة وکان
مخرباً غالیاً عن معاویۃ
واہل بیتہ یتظاہر بہ
ولا یتعذر منہ

وہ باطن میں شیعہ تعصب رکھتے تھے
اور ظاہر میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت
عمرؓ کو مقدم رکھتے تھے اور خلافت
کی اسی ترتیب کے قائل تھے لیکن
حضرت معاویہؓ اور ان کے گھرانے
سے سخت روگرداں تھے، برعکس

کا اظہار کرتے اور اس پر انفعال محسوس نہ کرتے۔

امام اسبکی نے ان کی طرف سے بڑی صفائی پیش کی ہے مگر کامیاب نہیں
ہو سکے۔ کیونکہ اکھوں نے دلیل یہ قائم کی ہے کہ جن بزرگواروں سے احکام
کو فیض ہے ان کا فیض یا فتنہ شخص افضی نہیں ہو سکتا حالانکہ دلیل بہت کمزور ہے
دیکھنا تو خود اس شخص کے عمل کا ہے کہ اپنے اساتذہ کے طریقے پر قائم رہا
یا اس سے ہٹ گیا۔ ان کی کتابوں سے ان کا تشیع پوری طرح ظاہر ہے
المسعودی نے بھی اہلہ واکابر سے تحصیل علم کی حتیٰ کہ اموی علماء سے بھی، مگر
کچھ رافضی تھے۔ مروج الذہب اس پر گواہ ہے۔ اس میں صحابی رسول
خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قدر جھوٹ بولے گئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں (منہاج السنۃ ج ۲، ص ۱۳۱) وفی تاریخ المسعودی من الاکاذیب ما لا یحصبہ الا اللہ تعالیٰ مسعودی کی تاریخ میں اتنا جھوٹ ہے کہ اس کا شمار سن اللہ تعالیٰ ہی جائے لیکن سیوطی جیسے لوگ جنہیں تحقیق سے کچھ مس نہ تھا محض طامع اللیل تھے۔ انہوں نے اہل السنۃ میں ہونے کے باوجود تاریخ الخلفاء میں ایسی لغویات بھر دیں کہ بہت لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔

ان اکاذیب کے ذریعہ وقائع تاریخی کی صورت مسخ کی گئی ہے اور اکابر امت کے بارے میں ایسی خرافات کو شہرت دی گئی ہے اور ایسے ایسے انداز میں ان اباطیل کو بیان کیا جاتا ہے کہ اہل تسنن بھی ناواقفیت کے سبب غلط راہ پر پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایات سے محترز رہتے کا حکم دیا ہے۔ اور اپنا مذہب یہ رکھا ہے کہ حجل و صفین کی طرح حادثہ کر بلا کے بارے میں بھی سکوت کیا جائے اور جن امور میں صحابہ کرام ملوث ہوں ان میں فرقی یقین سے گریز کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ اور وحدت امت اسی طرح قائم رہ سکتی ہے۔

دعوت عباسیہ اور آل عبد مناف ابوطالب

امیر المومنین

معاویہؓ نے صحیح بنیاد پر یہ اہتمام کیا تھا کہ خلافت اسلامیہ کو خالص عربی حکومت رکھیں تاکہ غیر عرب کو مسلم حکومت میں دخل ہو کر دعوت محمدیہ کو مسخ نہ کر سکیں کیونکہ مجوسی، یودی اور نصرانی لوگوں کو اپنی اپنی ثقافت پر بہت غرہ تھا یہ بڑی خطرناک ہوتی اگر انہیں محض اسلام قبول کرنے کے سبب حکومت

شریک کر لیا جاتا۔ اسی حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ مملکت اسلامیہ مستحکم رہی اور دین
مبین اپنی خالص شکل میں محفوظ رہا۔ لیکن ساٹھ ستر برس کی مدت میں نو مسلموں
کے دلوں میں یہ جذبہ رہ رہ کر ابھرتا تھا کہ دوسرے درجے کے شہری ہونے کی
بجائے انھیں بھی حاکمانہ اقتدار میسر آئے۔ آخر عہد اموی میں یہ صورت حال
شدت اختیار کر گئی اور وقت آگیا تھا کہ اب حکمت عملی میں تبدیلی لانی چاہئے۔
قبیلہ قریش میں سے بنو امیہ کے بعد یہ درجہ بنو ہاشم کا تھا کہ قیادت
کے لئے آگے بڑھیں۔ بنو ہاشم میں سے آل علی کی سبب تدبیریں پہلے ہی کئی بار
ناکام ہو چکی تھیں اور جو گروہ اپنے آپ کو ان کا حمایتی کہتا تھا اس کا کردار
ایسا رہا کہ علویہ کی جانیں تو ضائع ہوئیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا، پھر ایک بات
یہ تھی کہ آل علی کے سامنے سوائے حصول حکومت کے اور کوئی عمرانی منصوبہ
نہ تھا۔ ان کے تمام خروجوں میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ
اندازہ لگایا جاسکے کہ خلافت و حکومت پر وہ اگر فائز ہو جاتے تو انکالا کھ
عمل کیا ہوتا۔ ان میں جو بھی کھڑا ہوا اس نے صرف انسانی تعلیوں کا سہارا لیا
اور کوئی بات ایسی پیش نہ کی جس کے سبب لوگ اس کی حمایت پر کمر بستہ
ہو سکیں۔ علویہ کی حمایت میں یا ان کا قصاص لینے کے یہاں جو لوگ کھڑے
ہوئے ان کا مٹج نظر بھی صرف فساد تھا۔ اسی لئے جمہور صحابہ و آل البیت
نے انھیں امت کا دشمن قرار دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اقربیت کے دعوے سے کھڑے ہونے
والے ایک طرت آل عباس تھے اور دوسری طرت حضرت علی کی فاطمی اولاد
آل علی کی ناکامیوں کے سبب آل عباس نے اپنی تحریک ان سے الگ رکھی
حالات حاضرہ کے تحت اب ذرا دیکھی جائے گی کہ امت کی سربراہی اور دعوت

دعوت محمدیہ کی حفاظت و آبیاری کا انداز ایسا رکھیں کہ وحدت امت پیدا ہو۔
یوں یہ عظیم الشان دعوت شروع کی گئی جس نے اسلام کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ
کا دھارا موڑ دیا۔ اور وہ نظام پروئے کار آیا جسے چلانے کے لئے تمام کلمہ گو
صدیوں تک برابر کے حصہ دار رہے۔ سب اہل تاریخ متفق ہیں کہ اس
عجیب و غریب اور کامیاب ترین دعوت کا اجڑا ستارہ میں ہوا اور یہ زمانہ
امیر المؤمنین عمر ثانی امویؓ کا تھا۔

جبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پوتے حضرت محمد الامام عباسیؓ نے
اپنے داعیوں کو حکم دیدیا تھا کہ حجاز اور عراق میں کام نہ کریں بلکہ ابتداء خراسان
سے کی جائے۔ حجاز میں تحریک کی ضرورت نہ تھی اور عراق میں کام شروع کرنے
کا مطلب ہوتا کہ چھوٹے ہی دعوت کو تعمیری رکھنے کی بجائے تخریبی بنا دیا
جائے۔ چنانچہ عباسی داعیوں نے شرق و غرب میں ہزاراویہ نگاہ سے محنت
کر کے رائے عامہ اپنے حق میں استوار کی۔ جو لوگ ہموار ہو جاتے ان سے بیعت
لیجاتی تھی کہ امام کے ظہور پر ان کا ساتھ دیں گے۔ یعنی اس بات کا اہتمام تھا کہ
خليفة وقت کی بیعت توڑنے اور ان کی اطاعت سے منہ موڑنے کی ترغیب
نہیں دی جاتی تھی۔ بیعت آئندہ کے لئے لی جاتی تھی اور اس طرح قواعد شرعیہ
کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ خراسان میں کام کماں کرنے کے بعد سب سے آخر
میں عراق پر توجہ کی گئی۔ امام اعظمؒ اور امیر ہبیرہ کے عنوان کے تحت صورت
حال بیان کی جا چکی ہے، اس وقت حال یہ تھا کہ چاروں طرف عرب قبائل
خصوصاً مضر و کننی عرب آپس میں ایسے دست و گریباں تھے جیسے آل کا
کوئی سربراہ ہی نہ ہو۔ ہر طرف شورش اور خون خرابہ تھا، ان فتنوں میں عباسی
داعیوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور یہ انھوں نے خلافت قائم کر کے خلاف

نئی علامہ حرکت کی، البتہ امت کی اس خاتمہ جنگی سے انہوں نے فائدہ خوب ٹھایا
 ہر جگہ اپنے ہمہوا پیدا کئے۔ اور سب پر ثابت کر دیا کہ اختلال کی یہ صورت اس وقت
 رفع ہوگی جب آل بیت نبوت میں سے بتوالجیاس کے ہاتھ میں تمام کار آئے گی
 کیونکہ ہمارے امام کی دعوت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کو نبی رکھنے
 کے بجائے تمام مسلمانوں کو اس میں نمایندگی دیجائے اور ہر علاقے کے مسلمانوں
 کو اندرونی آزادی و خود مختاری حاصل ہو۔

اس حسن سے تعمیری انداز میں یہ تحریک چلائی گئی اور کامیابی سے ہم کنار
 ہوئی۔ صحیح ہے کہ داعیوں نے اپنے مقاصد کے تحت جوڑ توڑ سے بھی کام لیا۔
 لیکن یہ انتشار کو ہوا دینے کے لئے نہ تھا بلکہ غرض یہ تھی کہ اسی انتشار کو وجہ
 اختلاف بتایا جائے۔ لوگوں نے پروپیگنڈا کیا ہے کہ اہل خراسان کی فوجی
 طاقت کے ذریعہ عباسیوں نے ملت اسلامیہ پر اپنا تسلط قائم کیا اور برادر
 شمشیر حکومت پر قابض ہو گئے۔ گویا ان کے نزدیک خراسانی لوگ اتنے
 ہیبت ناک تھے اور ایسے ایسے تباہ کن آلات حرب کے مالک کہ پورے
 عالم اسلام کو اکھوں سے زیر کر لیا۔ اور وہ بھی دوسری صدی کے مسلمانوں
 کو جن میں سے ہر بالغ شخص ہتھیار بند تھا اور ماہر حرب و ضرب۔

اگر ان پروپیگنڈا کرتے والوں میں بھڑوسی سی بھی بے تعصبی ہوتی اور
 امت مسلمہ کی روح کا اکھیں ادراک ہوتا، جو جبر کے سامنے آج بھی نہیں
 جھکتی، تو ایسی بات نہ کہتے عباسیوں کا تسلط اس لئے قائم ہوا کہ احوال فقہ
 سے امت تالان تھی۔ اور پچا ہتی تھی کہ فتنہ و فساد رفع ہو کر یک جہتی آئے
 کیونکہ اموی حکمت عملی اب اپنی افادیت کھو چکی تھی۔ اور ہر جگہ کے لوگ
 حکومت میں برابر کا حصہ چاہتے تھے۔ اس طرح انقلاب کے لئے فضا

ہموار تھی اور قدرتی بات تھی کہ لوگوں کی نگاہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھ
 کی طرف اکھٹیں۔ آل علی کے عقیم اور بے نتیجہ اقدامات کے مقابلے میں صرف
 آل عباسؑ تھے، جن کا پیغام تعمیری تھا اور جن کی تحریک میں آزادی اور
 مساوات کی بشارت تھی۔ چنانچہ ہر جگہ کے مسلمان ان کی طرف جھکتے
 گئے، اور انہی کو امت کا نجات دہندہ سمجھا۔

عباسی امام نے ظہور اس وقت فرمایا۔ جب فضا انقلاب کیلئے تیار
 ہو گئی، امت کا کوئی متفق علیہ امام نہ رہا اور خود اموی خاندان میں بھی
 پڑ گئی۔ یوں تو زوال کے آثار امیر المومنین شہنامؑ کی آنکھ بند ہوتے ہی
 نمودار ہو گئے تھے۔ ایسے ہی جیسے اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد
 میں ہوا۔ لیکن غضب یہ ہوا کہ آخری متفق علیہ خلیفہ ولید ثانیؑ کو ۱۲۶
 میں افتراء و کذباً بدترین الزامات لگا کر شہید کر دیا گیا۔ اور یوں اپنے
 پاؤں پر خود کلہاڑی چلا کر اس گھرانے نے طوائف الملوکی کی صورت پیش
 کر دی۔ اس ہنسکاڑے کے بعد جناب مروان ثانیؑ نے خاندانی اختلال پر قابو
 پا کر معاملات سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اپنی اتالیقی فیصلتوں اور
 خصلتوں اور قائدانہ صلاحیتوں کے یا وجود وہ نہ ایسی مقبولیت حاصل
 کر سکے اور نہ اتنی باری طاقت کہ ملت کا اختلال دور کر سکیں اور مرکزیت
 پیدا ہو جائے۔ حالات ان کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ انکی بیعت
 میں ہوئی مگر اس سے پہلے ہی عباسی داعی میدان عمل میں کھل کر سامنے آچکے
 تھے اور اسی سال شراسان میں عباسی امام کی بیعت کی تکمیل ہو چکی تھی
 اور جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یعنی مروان ثانی کی آئینی حیثیت
 تسلیم نہ تھی کیونکہ اس کا انعقاد عباسی امام کی بیعت کے بعد اور اختلاfi ماح

میں کیا گیا تھا۔ عالم یہ تھا کہ دمشق کے قریب ہوار کے علاوہ امویوں کا اقتدار تھا
 رہا تھا اور کامیابی کے وسائل کم سے کم تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔

اس صورت حال سے پریشان ہو کر اور عباسی داعیوں کی روز
 افزوں گامیابیاں دیکھ کر امویوں کے ایک طرفدار علواں بن المقتنی نے
 وہ مشہور اشعار مروان ثانیؒ کو لکھ بھیجے جن سے اموی موقف کی کمزوری
 اور ان کی سیاسی زبوں حالی عیاں ہے۔ ان کے اس تخلص کو اس صورت
 حال کا کوئی مداوی نظر نہیں آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ انجام کی پروا کو
 بغیر مردوں کی طرح جان کی بازی لگادی جائے طبقات الشافعیہ الکبریٰ
 ج ۵، ص ۱۱۱ طبع مصر اس منظوم خط میں وہ کہتے ہیں۔

فَقُلْ لِّبَنِي أُمِّيَّةٍ لَيْتَ شِعْرِي ۖ
 أَأَيُّ قَاطِ أُمِّيَّةٍ أَمْ يَتَاهُمُ
 بنو العباس والجبش والهمام

وقد ظهرا لخراسانی معاً
 خراسانی ظاہر ہو گیا ہے اور اس کی پشت پر بنو عباس ہیں اور عظیم الشان لشکر
 قَانِ لَكُمْ تَجْمَعُوا جَيْشًا يَضِيقُ الْـ
 عراق عليهم والستاهم
 اگر تم لوگ اتنا لشکر جمع نہ کر سکو جو عراق اور شام کی سرزمین اپر تنگ کر سکے۔
 فَلَا قُوَّةَ لَهُمْ كَالْأَقْيَا عَلِيًّا
 بصفين معاوية الهمام

تو ان سے اسی طرح بھڑھایا جیسے وسائل کی کمی کے باوجود عظیم المرتبت معاویہ
 حضرت علیؑ سے متصادم ہو گئے تھے۔

وكان على أقوى منه عزفاً
 وأعلى رتبةً وهو الإمام
 حالانکہ حضرت علیؑ اپنے عزائم میں ان سے زیادہ قوی تھے ان کا رتبہ بلند تھا
 اور وہ خلیفہ تھے۔

وَلَا يَأْخُذْكُمْ حَذَرٌ وَخَوْفٌ

فَمَا يَغْنَىٰ إِذَا حَامَ الْحَمَامُ

اور تم پر ڈر اور خوف مستولی نہ ہو۔ جب میدان کا رزار گرم ہو جائے تو پھر پروا کا ہے کی۔

فَمُتُوا فِي ظُهُورِ الْحَيْلِ صَبْرًا

كَمَا قَدْ مَاتَ قَبْلَكُمْ الْكِرَامُ

تو گھوروں کی پیٹھوں پر اسی طرح استقلال سے جان دو جیسے تم سے پہلے غیر مند لوگ جان دے چکے ہیں۔

وَلَا تَسْتَدْرِعُوا أَوْأَبَ ذُلٍّ

وَعَارٍ قَدْ تَدْرَعُهَا اللَّعَامُ

ذلت اور عار کا ببادہ مت اور ٹھو۔ کیونکہ یہ ببادہ تو پست فطرت و ذہن لوگ اور مہاکرتے ہیں۔

ان اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اموی خلافت کے احوال دیگر گویا

ہو چکے تھے اور وقت آگیا تھا کہ انجام سے لے پرواہ ہو کر وہ ذلت کی زندگی پر

عزت کی موت کو ترجیح دیں اور ان اشعار سے یہ بھی عیاں ہے کہ حسین حرم و

عزم کے ساتھ دعوت عباسیہ جاری کی گئی اور اسے قبولیت عام حاصل ہوئی

اس کا یہ انجام ہوتا تھا کہ فتح سے ہم کنار ہوں اور اموی خلافت کا تختہ الٹ جائے

جناب مردان ثانی نے ان اشعار کے جواب میں لکھا تھا الحاضری یزی

قَالَ لَا يَزِي الغائب رجو حاضر ہو وہ ان باتوں کو دیکھتا ہے جسے غائب نہیں

دیکھ سکتا یعنی ہمیں کیا معلوم ہیں کن مشکلوں میں پھنسا ہوا ہوں (یعنی ایسے

مایوس کن حالات سے دوچار تھے۔

دعوت عباسیہ کے سلسلے میں ایک خود ساختہ تصور کو طرح

وہابی اقرار طرح پھیلایا گیا ہے کہ عباسیوں کی تحریک بنو امیہ کو خلاف تھی۔

اور مقصد یہ تھا کہ ان علویوں کے خون کا بدلہ لیا جائے جو اموی عہد میں اپنے
خروجوں کے سلسلے میں مقتول ہوئے تھے۔ اسی لئے عباسیوں نے سیاہ مانتی
لیاس اختیار کیا اور جھنڈا بھی اپنا سیاہ رکھا۔ بعض افسانہ نگاروں نے یہاں
تک کہہ دیا کہ دراصل یہ تحریک علویہ کی تھی اور ان کی ہمدردی میں عباسی لوگ
س میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن جب کامیابی حاصل ہو گئی تو خلافت علویوں
کے سپرد کرنے کی بجائے خود امیر قایض ہو گئے۔ یہ تصدیق وہی ہے جو شکست
خوردہ بے تدبیر نامقبول لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔

عباسیوں کو علوی مقتولوں کا بدلہ لینے کی کیا ضرورت تھی جب کہ یہ خروج
ورقدمات ان کی رائے کے خلاف کئے گئے تھے اور قواعد دینیہ کے تحت انکی
کوئی گنجائش نہ تھی، پھر دیکھنا ہے کہ حضرت حسینؑ کے خون کا بدلہ لینے اول
التدابیر کھڑے ہوئے اور پھر مختار ثقفی۔ لیکن بنو ہاشم نے ان دونوں قتلوں
سے کوئی تعلق نہ رکھا بلکہ سخت بیزاری ظاہر کی۔ بنو ہاشم تو اس زمانہ میں
بنو امیہ کی خلافت کے ایسے حامی تھے کہ انھوں نے ابن الزبیر سے بھی بیعت
نہیں کی اور منتظر رہے کہ امیر المؤمنین عبدالملکؑ کامیاب ہوں تو ان سے بیعت
کی جائے۔ کیونکہ امت کا اختلال رفع کر کے مرکزیت پیدا کرنے کی قابلیت اسی
یگانہ روزگار جلیل میں تھی اور آئینی حیثیت سے موقف بھی انہی کا صحیح
تھا۔ کیونکہ خلافت میں ارباب حل و عقد کے عام اجتماع میں مروانی خلافت پر
اجماع ہوا تھا۔ برخلافت اس کے ابن الزبیر کا موقف کمزور تھا۔ بنو ہاشم اور
اکابر صحابہ ان کے ادعائے خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ انھوں نے
متفق علیہ امام امیر المؤمنین زیدؑ سے بیعت نہیں کی تھی اور صحابہ کرامؓ کی ایمانی
فیصلے کی بے وقعتی کر کے اختلال پیدا کر رکھا تھا۔ انھیں جو تھوڑی سی وقتی

کامیابی نصیب ہوئی تو محض اس لئے کہ کھل کر اپنی خلافت کا اعلان اکھنول نے
امیر المؤمنین زید کی وفات کے بعد کیا تھا، اسی لئے بعض صفار صحابہ ان کے
ساتھ ہو گئے تھے۔ مگر ان کا زمانہ کہلاتا ہے ”فتنوں کا زمانہ“ صحاح میں
جہاں کہیں اس دور کا ذکر ہے تو فتنہ ابن الزبیر ہی کی حیثیت سے ہے۔
صحیح بخاری میں ابن الزبیر اور امیر المؤمنین عبد الملک کے بارے میں
حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول موجود ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا راج ۳ کتاب
التفسیر، باب قولہ ثانی الثین اذ ہما فی العاص ۳۶ طبع مصر

ان ابن ابی العاص یوزع ممشی القدامیہ یعنی عبد الملک بن
مروان واثم لوی ذنبہ یعنی ابن الزبیر ابوالعاص کے قریب
مردانہ وار بڑھ رہے ہیں یعنی عبد الملک بن مروان، اور یہ جو صاحب ہیں
تو اکھنول نے اپنی دم سیکڑ رکھی ہے یعنی ابن الزبیر، اگر ابن الزبیر کو بنو
ہاشم اور اکابر صحابہ کی حمایت حاصل ہوتی اور ان کی خلافت کی آئینی حیثیت
تسلیم کر لی گئی ہوتی۔ تو پھر اہل شام کی کامیابی کا امکان نہ تھا۔ اور وہ
یا غی اور خارجی قرار پاتے۔

رہا زید بن علی بن الحسین کا خروج تو اس کا بھی یہی حال تھا کہ ہاشمی گھر
کے کسی ایک فرد نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا، بلکہ ہر طرح کوشش کی کہ سیاسی
کے بہکائے میں آکر متفق علیہ امام کی بیعت توڑنے سے احتراز کریں پھر ان کا
بدلہ لیتے کا تصور عیاسیوں کے ہاں کیوں پیدا ہوتا اور وہ اپنی عوامی تحریک
کو خاندانی جھگڑا بنانا ڈالنے کی غلطی کیوں کرتے۔

عیاسیوں کی تحریک خاندان بنو امیہ کے خلاف نہیں تھی بلکہ ان کے
سیاسی نظام کے خلاف ایک عوامی تحریک تھی اور اس کا علویہ سے کچھ

مقنہ تھا بلکہ یہ اہتمام رکھا گیا تھا کہ جو لوگ علویہ کے حمایتی کہلاتے تھے انھیں
 اس تحریک سے دور رکھا جائے۔ یہ تحریک اس غرض سے چلائی گئی تھی کہ خلافت
 عربی رکھنے اور غیر عرب مسلمانوں کو اس سے دور رکھنے کے سبب عوام میں بھینتی
 پھری رہی تھی۔ امویوں کی جگہ اگر اس وقت کوئی اور خاندان ہوتا تب بھی
 تحریک اسی طرح چلائی جاتی۔ کیونکہ امت کے احوال ایک عظیم الشان
 انقلاب کے متقاضی تھے۔ اور ضروری ہو گیا تھا کہ عباسی امام کے حق میں
 نئے عامہ استوار کی جائے، ایسا یہ فراہم کئے جائیں اور موزوں وقت پر
 قدام کیا جائے کہ کامیابی متوقع ہو۔

سیاہ رنگ

عربوں میں نہ پہلے سیاہ رنگ کو مانتی کبھی سمجھا جاتا تھا اور نہ
 آج سمجھا جاتا ہے۔ اس رنگ کے مانتی ہونے کا تصور
 نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو جھنڈے تھے ایک سیاہ جو ظل کہلاتا تھا
 سیاہ اور ایک سفید جسے شجاب کہتے تھے (بادل) اموی خلافت میں سفید
 رنگ اختیار کیا گیا اور عباسی خلافت میں سیاہ۔ اور یہ دونوں رنگ ابتداء
 میں اختیار کئے گئے تھے۔ سیاہ رنگ کو ترجیح دینے کا ایک تاریخی پس
 منظر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قاتحانہ شان کی تکمیل فتح مکہ ہی ہوئی
 اور اس وقت سیاہ عمامہ آپ زین کبر کے ہوئے تھے۔ پھر غزوہ بنو نضیر
 میں کی اہمیت قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اس غزوے نے اہل ایمان کا ایمان
 اور اہل نفاق کا نفاق ظاہر کر دیا۔ اس ہم کی قیادت خود سرور کائنات صلی
 اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔ اس غزوے میں آپ کا جھنڈا سیاہ تھا اور آپ کے
 علمبردار تھے حضرت صدیق اکبرؓ، ابن عساکر، ابن ہشام، طبقات ابن سعد
 پھر الاصابہؓ فی تمییز الصحابہؓ میں ہے۔ (رج ۲) بنو سعد بن مالک

کہ حضرت سعد بن مالک ابوالکنودؓ کو اپنے جو جھنڈا عطا فرمایا تھا وہ سیاہ تھا اور اس پر سفید ہلال کا نقش تھا۔ رراتہ سودا در فیہا ہلال ابیض (غرض یہ ہے کہ بھی تو جہات بے اصل ہیں۔ ماتم داری کیا کرتے ہیں شکس خوردہ تا کام لوگ۔ کامیاب و کامراں اصحاب عزیمت کو ماتم داری سے کیے واسطہ۔ وہ اگر وقتی طور پر ناکام ہو جائیں تب بھی ان کے ہاں رونا پینا نہیں ہوتا بلکہ نئے عزم اور نئے دلوں سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ رسم تو چوتھی صدی ہجری میں نجوسی الاصل بویہی خاندان کے معزالدولہ نے اس وقت جاری کی جب وہ اور اس کے اہل خاندان امور خلافت پر مستولی ہو گئے۔ اور طاقہ کے بل پر زندہ و اتحاد کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ سیانیوں نے اموی عباسی خلافت کے سرکاری رنگ سفید و سیاہ کے مقابلے میں سبز رنگ میں اختیار کر لیا تھا جو نجوسی معبد کے جھنڈے کا رنگ تھا۔

اموی سادات انقلاب حکومت کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت عباسی میں اموی سادات کے ساتھ جو گنا اور خانوادہ خلافت امویہ کے ساتھ خصوصاً عباسی خلفاء کا برتاؤ اس صلہ رتبی پر مبنی تھا جس کے وہ حقدار تھے۔ تاریخ میں ان بیسیوں اموی بزرگوں کے اسماء گرامی محفوظ ہیں۔ جنہیں خلافت کے اہم مناصب پر فائز کیا گیا اور انہیں خلفاء عباسیہ کے ہاں وہی برادرانہ تقرب حاصل تھا جو باہلیت اور اسلام میں بنو ہاشم اور بنو امیہ میں ہمیشہ قائم رہا۔ یہ موضوع بہت طویل ہے۔ مختصراً چند حضرات کے اسماء گرامی یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ اور اس سے اندازہ لگے گا کہ عباسی کی تحریک کسی خاندانی یا نسلی پسندیت کے تحت نہ تھی بلکہ ملت کی خیر خواہی اور امت کے ارتقاء کے لئے اسے جاری کیا گیا تھا۔ چنانچہ خلافت قائم ہوئی۔

کے بعد اس دعوت کی آبیاری میں ان تمام حضرات کو شریک کیا گیا جو اس کے اہل تھے۔
ایرانی و اقصیٰ کا انھیں احساس تھا۔ جو لوگ دعوت محمدیہ کے علمبردار ہوتے ہیں ان کے
ہاں نسلی، لسانی، ملکی اور ایسے ہی دوسرے زمینی امتیازات کی گنجائش کہاں
ہوتی ہے۔

اب ملاحظہ ہوں اموی خاندان کا خلافت اور دوسرے اموی سادات
کے اسماء گرامی اور عباسی خلفاء کے ساتھ ان کے تعلقات خصوصی۔

۱۔ عبدالعزیز بن امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز۔ یہ اموی بزرگ، آخری
اموی خلیفہ جناب مروان ثانیؒ کے عہد میں والی مدینہ تھے۔ امیر المؤمنین المنصورؒ
نے انھیں اپنا ندیم بنالیا۔ چنانچہ وہ ان کے مخصوص لوگوں میں سے تھے، سیاہ
سرکاری لباس پہنتے و کان فی صحابہ تا ابی جعفر المنصور خاصاً
بہ ممن یلبس لسواد و یلا منہ حیث کان را بن حزم جہرۃ
الانساب صفحہ ۱۹

۲۔ انہی مروان ثانیؒ کی صاحبزادیاں اور اعزہ مصر میں تھے ان کی شہادت کے
بعد انھیں سب کو عزت و احترام کے ساتھ ان کے وطن حراں بھیجا دیا گیا اور
ان کے لئے پیش قرار و طبقہ مقرر کر دیا۔ امیر المؤمنین المہدیؒ نے اس وظیفہ
میں اور اضافہ کر دیا۔ ریسٹری آف سیرینز ص ۱۸۳ (مطبوعہ ۱۹۴۹ء)

۳۔ اموی سادات کے جو خاندان کوٹ اور لیسے میں آباد تھے ان کے
ساتھ امیر المؤمنین ابو جعفر المنصورؒ کے رشتہ مناکحت استوار کیا، آپ کی
یہ اموی زوجہ محترمہ خالد بن اسید بن ابی العیص بن اُمیہ کے اخلاق میں سے
تھیں ان سے آپ کے دو فرزند پیدا ہوئے علی و عباس اور ایک دختر عالیہ
دوسری اموی خاتون سے اپنے فرزند عمید امیر جعفر کا نکاح کیا۔ جو سید زبیدہ

کے والد ماجد ہیں۔ پھر اپنے دوسرے فرزند اور ولی عہد امیر محمد المہدیؑ کا نکاح
سیدہ رقیہ بنت عمرو بن خالد بن عبداللہ بن عمرو بن امیر المؤمنین عثمانؓ سے کیا اور
ان سے ان کے دو فرزند پیدا ہوئے۔ ایسے ہی اور بھی رشتے قائم کئے

۴۔ حضرت یحییٰ بن سعید بن ایان ابن سعید بن العاص اموی جو بلند پایہ
حدث تھے اور کوفے کے ساکن، انھیں اپنے پاس تعداد دلا لیا۔ اور اپنی صحبت کا
شرف عطا فرمایا۔

۵۔ عبداللہ بن عاصم بن امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیزؒ کو امیر المؤمنین محمد
المہدیؑ نے مسجد نبویؐ کی توسیع کا متولی بنایا۔ امیر جعفر بن سلیمان عباسی شہ
والی مدینہ تھے رفیع البیلدان ج ۱ ص ۲۷ ترجمہ

۱۔ آل امیر المؤمنین عبدالملکؒ۔ طبری اور ابن خلدون وغیرہ جاتے تصریح کی
ہے کہ امیر المؤمنین المہدیؑ کا گزرا امیر مسلم بن امیر المؤمنین عبدالملکؒ کے قصر پہ
ہوا، تو ان کے عم بزرگوار عباس بن علی السجادؑ آئے بتایا کہ جب حضرت محمد الامامؑ
اس طرف آئے تھے تو امیر مسلمؒ نے ان کی ضیافت کی تھی اور چار ہزار دینار
نذر کئے تھے۔ امیر المؤمنین نے حضرت مسلمؒ کے فرزندوں کو طلب فرما کر
بیس ہزار دینار مرحمت فرمائے اور ان کا بیش قرار و طیفہ مقرر کیا۔ ان کی نسل
کے لوگ بنی مسلمہ سے معروف ہیں اور ان کے بعض حامل آثار خاندان مصر کے
علاقہ الاشموین میں آباد ہیں۔ (الاعلام تذکرہ ج ۸ ص ۱۲۲)

۲۔ طبری اور ابن خلدون نے بتایا ہے کہ مسلمہ میں حبشیوں نے مدینہ طیبہ
میں لوٹ مار کی اور فساد کیا تو اس وقت مسجد نبویؐ میں نماز پڑھانے کے لئے ایک
اموی نوجوان بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے امامت کے لئے بڑھے میں الا صبیغ
بن سقیان بن عاصم بن عبدالعزیز بن مروان ہوں اور امیر المؤمنین ابو جعفرؑ

طاعت کے ساتھ تم کو نماز پڑھاتا ہوں (طبری ج ۳ ص ۲۵۳)۔
 ۸۔ علی بن عبد اللہ بن خالد بن یزید بن حضرت معاویہ جو السقیانی کہلاتے تھے اور مادی نسب میں عباس بن علی بن ابی طالب کے نواسے تھے دمشق میں سکین گزین تھے، خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں علم بغاوت بلند کیا اور ۱۹۵ھ میں مارے گئے (الاعلام زر کلی ج ۵ صفحہ ۱۱ و دیگر کتب)۔
 ۹۔ ابومروان محمد بن عثمان اموی۔ آپ امیر المؤمنین المعتمد باللہ اور ان کے فرزند امیر المؤمنین الواثق باللہ کے زمانہ میں مکہ معظمہ کے قاضی تھے۔
 جہرۃ الانساب ص ۷۸۔

۱۔ بغداد کا عدلیہ اور اموی قضاۃ۔ امیر المؤمنین جعفر المتوکل علی اللہ کے عہد سے لے کر ڈھائی سو برس تک بغداد کے عدلیہ پر اموی سادات فائز رہے۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں جہرۃ الانساب ص ۱۰۵۔
 القضاۃ فی بغداد متردد فی
 بنی ابی عثمان بن عبد اللہ بن
 خالد بن اسید بن ابی العیص
 بن امیۃ من عہد المتوکل
 الی زماننا ہذا وہم الی
 لشوارب

بغداد میں عہد قضاہ پر امیر المؤمنین المتوکل علی اللہ کے عہد سے ہمارے زمانے تک ابی عثمان بن عبد اللہ بن خالد بن اسید بن ابی العیص بن امیہ کے خاندان میں متوارث چلا آتا ہے یہ لوگ بنو ابی الشوارب کہلاتے ہیں۔
 ان میں علی بن محمد بن عبد الملک بن محمد بن الشوارب اور محمد بن عبد اللہ اموی بغداد کے قاضی القضاۃ تھے۔ اسی طرح العاص بن محمد اموی بصرے کے قاضی تھے۔ علامہ ابن کثیر نے سنۃ ۱۰۰ھ کے واقعات میں ابوالحسن احمد بن محمد بن عبد اللہ بن عباس بن محمد بن عبد الملک بن محمد بن الشوارب لفرشی الاموی کو

قاضی القضاۃ بتایا ہے۔ بغداد میں وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ
بڑے فاضل و زاہد تھے بارہ برس قاضی القضاۃ رہے۔ بصرے میں دوسرے
اموی خاندان حضرت ابو سفیان کے فرزند عتبہ کی اولاد میں تھا۔ ان میں مشہور
ادیب و مصنف محمد بن عبد اللہ بن عمر و ابو عبد الرحمن اموی العتبی تھے رحمہ اللہ
ان کے بعد اعلیٰ امیر المؤمنین حضرت معاویہ کے بھائی عتبہ کی نسل میں ایک مشہور
عالم و مصنف محمد بن احمد بن محمد بن اسحاق بن الحسین بن المنصور بن معاذ
بن محمد بن عثمان بن عتبہ بن ابو سفیان تھے جو بقول علامہ ابن کثیر لغت و
النساب کے عالم النساب العرب پران کی تالیف ہے وہ خراسان کے ابی درہ
مقام کے ساکن تھے۔ اس شہر کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ المؤتلف و المستملع
پران کی کتاب بھی ہے ۵۷۰ھ میں وفات ہوئی راہبرایہ ج ۱۲ ص ۱۷۱
ایسے ہی اور بھی علماء و فضلاء اس دودمان عالیشان کے عراق و شام وغیرہ
آباد تھے۔ مثلاً عبد اللہ بن سعید بن عبد الملک بن مردان جن کی کنیت ابو صفور
تھی۔ امیر المؤمنین عبد الملک کے پوتے ہیں۔ یہ دمشق میں رہتے تھے، کتاب
النواویر کے مصنف ہیں ۵۷۰ھ میں بعد امیر المؤمنین المنصور وفات پانچواں
اموی دودمان عالی شان کے بڑے بڑے علماء و راویاء اللہ عنہم
میں مشہور نام تھے۔ ادران کے فیوض سے یہ امت بہرہ ور تھی مثلاً ابوالولید
حضرت حسان بن محمد بن احمد بن ہارون بن حسان بن عبد اللہ بن عبد الرحمن
عنبنہ بن سعید بن العاص القرشی الاموی۔ جو خراسان میں امام اہل حدیث تھے
اور مرجع تلامذہ۔ ان کی پیدائش کی بشارت ان کی والدہ ماجدہ کو خواب
میں ملی تھی۔ اور خدا تعالیٰ کے یہاں انھیں اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ ابوالحسن
عبد اللہ بن محمد الفقیر فرماتے ہیں۔ مجھ پر اگر کوئی علمی مشکل پیش آئی یا دنیوی

کوئی پریشانی ہوئی تو میں حضرت ابوالولیدؓ کے مزار پر حاضر ہوتا اور ان کے
توسل سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا تو میری مشکل حل ہو جاتی تھی (طبقات
الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲، ص ۱۹۱-۱۹۲۔ طبع مصر) مسئلہ میں پیدا ہوئے
در مسئلہ میں وفات پائی۔

غرض یہ ہے کہ سیاسی انقلاب میں جتنا کشت و خون ہوتا ہے اس انقلاب
میں بھی ہوا۔ لیکن لوگوں نے عجیب غریب بہیمانہ حرکتیں عباسیوں سے منسوب
کر دی ہیں کہ جن جن کراہک ایک اموی کو قتل کیا گیا اور خلیفہ پشین کے مزار
کی بے حرمتی کی گئی۔ امیر المؤمنین ہشامؓ کی لاش قبر سے نکال کر سولی پر لٹکائی
گئی، اس کے کورے مارے گئے اور پھر جلادیا گیا۔ اسی طرح نثر انہی اموی
سادات کو قتل کر کے ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا
دسترخوان کیسے بچھا یا اس کا ذکر نہیں۔ یہ حد درجہ مکروہ و بے بنیاد روایت
سب سے پہلے ابو مخنف جیسے مؤلف نے جسے سب ہی المکرہ رجال نے کذاب
بتایا ہے اپنی کتاب میں درج کی تھی اسی کذاب راوی سے بعد کے مؤلفین
تحقیق کی آنکھ بند کر کے نقل در نقل کرتے رہے ہیں۔

اسی قسم کی ایک لڑخیز روایت طبری نے یہ لکھی ہے کہ جیسا امیر المؤمنین
المہدیؑ نے مسند خلافت کو رونق بخشی تو انھوں نے قصر خلافت میں ایک کمرہ
دیکھا جو مقفل رہتا تھا۔ انھیں تجسس ہوا کہ اس کمرے میں کیا ہے، اس کو کھلوا یا
تو دیکھا کہ بے شمار آدمیوں کی کھوپڑیاں صافات کی ہوئی رکھی ہیں اور ہر ایک پر
برجی لگی ہوئی ہے کہ یہ سر کس کا ہے۔ آپ یہ منظر دیکھ کر لڑ گئے اور سب کو دفن
کرا دیا۔ یعنی بیٹے کو جو ولی عہد بھی تھا یہ خبر نہ تھی کہ ابا جان کیا حرکتیں کیا
کرتے تھے۔ آخر لوگوں کا قتل ہونا ان کی کھوپڑیوں سے کھال اتارنا اور صفائی

کرتا۔ پھر کوٹھری میں قرینے سے رکھنا اور نقشوں کا بیٹھ کر ہر ایک کے نام کی پر
 لگانا کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے۔ یہ سب کام ایسے چپ چپاتے ہوتا تھا کہ کسی
 کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ بیٹوں کو بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ لکھنے والوں
 یہ لغویات اپنے مقاصد کے تحت لکھیں، لیکن شرم انہیں نہیں آتی جو حواس
 دے کر انہیں بیان کرتے ہیں اور باور کرانا چاہتے ہیں کہ قہر خلافت امیر
 گاہ انا نام نہیں تھا بلکہ بوچر خاتہ تھا۔ لعنة اللہ علی الکاذبین۔
 انقلاب کی ایک ایک بات امیر عبدالرحمن الدراخل اموی کی دیکھی ہو
 تھی۔ انہوں نے ہسپانیہ جا کر یہ باتیں کیوں نہیں بیان کیں اور وہاں
 مصنفوں نے انہیں کیوں نہیں لکھا۔ حالانکہ انہیں خوب نمک مرچ لگا
 لکھنا چاہئے تھا۔ یہ سب روایتیں سیائی راویوں کی بیان کردہ اور شیعہ مصنفوں
 کی اپنی کتابوں میں درج کردہ ہیں جنہیں دوسرے لوگ نقل و نقل کرتے رہے
 جاتے ہیں۔ اور عقل کو کام میں نہیں لاتے۔ ہمیں تو یہ ملتے ہے کہ جب حضرت
 الدراخل ہسپانیہ میں منہمکن ہو گئے تو اپنے اہل و عیال کو دمشق سے بلوایا۔ ان
 خانوادہ خلافت کے ایک ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا تو یہ لوگ ایسے بچ گئے
 جو لوگ مزارات اکھاڑ پھینکنے اور لاشوں پر تازیانے برساتے والے ہیں
 مردوں کی ہڈیاں جلوانے والے ہوں۔ اور تڑپتی لاشوں پر
 خوان بچھا کر کھانا کھائیں۔ ان کی بہیمانہ حرکتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمام
 امت ان سے ناراض ہو جائے اور جیسے ایک حکومت کا تختہ الٹا تھا
 بھی الٹ دیتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اموی خلافت بھی سویرس تک
 مقبول رہی کہ ان کے مقابلے میں کوئی ہنگامہ کار کرنے ہو سکا۔ اور عیاں
 خلافت بھی نہ انداز پانچ سویرس بغداد میں اس شان سے قائم رہی کہ جو بھی

خلافت کھڑا ہوا، اس نے منہ کی کھائی۔ پھر یہ بات بھی عجیب ہے کہ اموی خلافت مشرق میں ختم ہوئی تو مغرب میں قائم ہو گئی اور امارت کی حیثیت سے پھر خلافت کی صورت میں۔ اسی طرح خلافت عباسیہ تعداد ختم ہوئی تو مصر میں دوبارہ عباسی خلافت ہی کا احیاء کیا گیا۔ بر خلافت اس کے جو افراد ان خلافتوں کے خلافت کھڑے ہوئے ان کے سب عزائم خاک میں مل گئے، اس تاریخی حقیقت کی روشنی میں وضعی مناقب و فضائل اور مظلومیت کی داستانیں کب قابل اعتناء رہتی ہیں۔ اور کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اپنے اپنے وقت میں اموی اور عباسی خلافتوں کو قبولیت عام حاصل نہ تھی اور لوگ دیوانہ وار ان ہستیوں پر فدا تھے جو وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلافت کھڑے ہو کر ناکام رہے۔

امیر المومنین المامون کے زمانہ میں عباسیوں کی مردم شماری کی گئی تو چھوٹوں، بڑوں، مردوں اور عورتوں کی تعداد تیس ہزار تین تھی رضی اللہ عنہ (ص ۱۲۶) اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باقی ہاشمیوں اور طلبیہ کی تعداد کتنی ہو گئی۔ بعد کی صدیوں میں جو اصرافہ ہوا وہ اپنی جگہ ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اموی اور عباسی خلافتوں میں ڈھائی سو برس کے اندر حسینیوں اور حسینیوں کے خوجوں کی تعداد پینسٹھ کے قریب ہے ملاحظہ ہو تحقیق مزید سلسلہ خلافت معاویہ ویزید ان میں سے کسی کو اتنے حمایتی میسر نہ آ سکے کہ معمولی حقیقت سے زیادہ امت کو کچھ نقصان پہنچا سکیں۔ پھر ان میں ایک بھی خروج ایسا نہ تھا جس میں کھڑے ہونے والے کو اس کے اپنے گھرانے کے لوگوں نے غلط اقدام سے نہ روکا ہو۔ اور اس کا ساتھ دینے سے گریز نہ کیا ہو۔

لہذا یہ سمجھنے کی گنجائش نہیں کہ امویوں اور ہاشمیوں میں یا عباسیوں اور علویوں میں کوئی خاندانی حقیقت کھنی۔ یہ سب آپس میں شورش کرتے اور ان کے باہمی رشتے پیہم و متواتر ہوتے رہے اور آج تک ہوتے ہیں۔ سیاسی خلفشار جو گئے چنے لوگوں نے پیدا کیا، اس کا کوئی اثر ہاشمیوں و امویوں کی اپنی مودت اور تعلقات خویشی پر نہیں پڑنے دیا۔ لیکن ہوا پرست لوگوں نے ان ہزاروں علوی سادات کو فراموش کر کے بعض افراد کے شخصی اقدامات کو خاندانی اور نسلی نزاع کی صورت دیدی۔ بلکہ انھیں دینی رنگ دینے سے بھی گریز کیا۔ یہ نہ سوچا کہ امویوں اور علویوں میں، عباسیوں اور عباسیوں میں، حسینیوں اور حسینیوں میں، حسینیوں حسینیوں میں بھی سیاسی بنا پر خوں ریزی ہوئی۔ جب ان واقعات کو خاندانی یا دینی نہیں بتایا گیا اور افراد تک محدود رکھا گیا تو ان پیٹھ خروچوں کو یہ اہمیت کیوں دی جائے۔ جو دیدی گئی ہے۔ اور امت میں مستقل افتراق کا سبب بنا دیا گیا ہے جب خود امویوں، عباسیوں اور علویوں نے ان واقعات کو اہمیت نہیں دی اور باہمی مودت و قرابت کے تعلقات کی خوش گواری قائم رکھی، تو بعد کے لوگوں کو کیا حق ہے کہ وہ پرانی باتوں کو ہوا دیتے رہیں اور گڑھے مردے اکھاڑیں۔

امت کے سواد اعظم کا ہمیشہ یہ وتیرہ رہا اور یہی سنت صحابہ کرام کی ہے کہ اگر وقتی اختلاف پیدا ہو حتیٰ کہ جنگ و جدل تک تو بیت پہنچ جائے تو وقت گزر جانے پر اختلاف نے سب کچھ بھلا دیا اور وحدت امت قائم رکھی، اسی کے نتیجے میں ارتقاء ہوا اور دنیا میں مسلمانوں کی دھاگ بیچی ان لوگوں کو ڈیڑھ ہزار برس کے اس تجربے کے باوجود یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ گزرے ہوئے حوادث کا ہیجان انگیز تذکرہ تعمیری نہیں ہے۔

تخریبی ہے۔ اخلافت کے قلوب منہلات کی طرف سے بکدر ہوتے ہیں اور گورے ہوئے لوگوں کی ہستیاں زیر تنقید آتی ہیں۔ منہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم کسی خاص طبقے کے ساتھ مخصوص نہیں اور غلط بات کی تیقح تو اہل فکر کو کرنی ہی پڑتی ہے۔

علویوں کے پیسٹھ خروج، اور ملت اسلامیہ کے ساتھ چھیا سٹھویں قدری، شریف حسین کی، ایسی حرکتیں نہیں ہیں کہ امت مسلمہ کو ان لوگوں سے کوئی سہر دی ہوتی اور وہ انھیں خلافت پر فائز کرنے کے لئے کسی درجے میں تیار ہو سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ ان لوگوں کو کبھی کامیابی نہ ہو سکی اور ان افراد کی حرکتوں کا نتیجہ سوائے فتنہ و فساد کے اور کچھ نہ نکلا۔ یہ فساد اگر معمولی سیاسی چپقلش کی طرح کے ہوتے تب بھی ایک بات بھٹی مگر اکھٹوں نے تو آپس میں بہیمانہ اور بے شرمناک بلکہ ناپاک حرکتیں کیں کہ قلوب ان کی طرف سے ہٹتے چلے گئے۔ مثلاً۔

۱۔ حسین بن الافطس بن الحسن بن علی بن الحسینؑ:۔ ان صاحب نے امیر المؤمنین المامونؑ کے عہد میں خروج کیا۔ کعبہ شریف کے ستونوں پر ختمنا سونا چڑھا ہوا تھا وہ کھرج لیا۔ اور کعبہ کے خزانے میں جتنی نفیس اشیاء تھیں انھیں لوٹ لیا۔ لوگوں کا مال و متاع ہتھیانے کے علاوہ ان پر ایسے ایسے مظالم کئے کہ اکثر لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ بیان عمدة الطالب کے شیعہ مورخ و کتاب کا بھی ہے۔

۲۔ محمد بن جعفر الصادقؑ:۔ اپنے صادق باپ کا یہ کاذب بیٹا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیثیں بیان کیا کرتا تھا۔ ابن الافطس نے جب دیکھا کہ اس کی حرکتوں سے لوگ انتہائی متنفر ہو گئے ہیں

تو محمد بن جعفر (۴) کو درغلا کر اس کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ لیکن علامہ
خالدون لکھتے ہیں۔

بعد چندے محمد بن جعفر الصادق کے لڑکے علی اور حسین
ابن الا فطس نے ہاتھ پاؤں نکلے اور طرح طرح کی بد اعمالیاں
کرتے لگے۔ زنا، اغلام اور سر بازار عورتوں کو بے محنت کرنا شروع
کر دیا اور اتنا کہ حسین عورتوں کو اپنی عصمت بچانی مشکل ہو گئی
اور اکھنوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ پھر کہاں کہیں کوئی
خوبصورت لڑکا نظر آجاتا۔ اس پر یہ لوگ ٹوٹ پڑتے
حتیٰ کہ قاضی مکہ کو بھی نہ چھوڑا۔

امیر المؤمنین المامون نے سر کوئی کے لئے لشکر بھیجا تب اس قتلہ
نجات ملی۔ اب یہ امیر المؤمنین کا عقوبت تھا کہ چونکہ محمد بن جعفر نے توبہ کی اور حالت
وضع کرنے پر شرمندگی ظاہر کی تو اسے معاف کر دیا۔

(۳) زید النار بن موسیٰ (الکاظم) چند دن کے لئے اس شخص نے بصرہ
میں شورش بپا کی۔ عیاسیوں کے گھر جلا دیئے، لوگوں کا مال و متاع لوٹ
یاغلوں کو آگ لگا دی۔ اس لئے زید النار کہلایا۔ جب گرفتار ہو کر امیر المؤمنین
المامون کے حضور پیش ہوا، تو اپنے اپنے رجم و کرم کے سبب اسے معاف
کر کے اسکے بھائی اور اپنے داماد امیر علی الرضا کے پاس بھیج دیا۔ مگر وہ اس
حکمتوں سے اتنے ناراض تھے کہ مدت العمر اس سے بات نہیں کی رجم
الطالب ص - ۲۱)

۴۔ ابراہیم اچتر بن موسیٰ (الکاظم) اس شخص نے یمن میں فساد کیا
اتنے لوگوں کو قتل کیا اور ان کا مال لوٹا کہ اس کا نام اچتر ابرہ گیا یعنی قصاب

گرفتار ہوتے پر امیر المؤمنین المامون نے اسے بھی معاف کر دیا۔

(۱۵) اسماعیل بن یوسف بن ابراہیم بن موسیٰ بن عبداللہ بن الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب۔ اس شخص نے امیر المؤمنین المستعین باللہ کے زمانے میں مکہ معظمہ کو آجگاہ فساد بنایا۔ والیدایہ والہایہ میں ہے راج ۱۱

ص ۹، نیز طبری میں ہے۔

واخلت ما فی الکعبۃ من الذہب
والفضۃ والطیب وکسوة
الکعبۃ۔

کعبہ میں جتنا سونا، چاندی، عطر
اور پردے غلات تھے وہ سب
لوٹ لئے۔

پھر بقول طبری راج ۱۱، ص ۱۲، نیز الہدایہ والہایہ ج ۱۱، ص ۱۰ و
اعترض الحجاج فقتل منهم جمعا کثیرا و نہ ہر راجیوں کے
قاتلے پر لوٹ پڑا بہت سے لوگوں کو شہید کیا۔ اور ان کا مال لوٹ لیا پھر
یہی حرکتیں اس نے مدینہ طیبہ میں کیں۔

وہوالذی حاصر المدینۃ
حتی مات اہلہا جوعا و لجم
یصل احد فی مسجد رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اس شخص نے مدینہ طیبہ کا محاصرہ
کر لیا یہاں تک کہ وہاں کے لوگ
بھوکوں مر گئے اور مسجد نبوی میں کوئی
شخص نماز نہ پڑھ سکا۔

۴۔ محمد بن حسن بن محمد بن ابراہیم بن الحسن بن زید بن الحسن بن علی بن ابی
طالب۔ ۲۵۶ھ میں اس شخص نے امیر المؤمنین المعتد علی اللہ کے زمانے میں
خروج کیا۔ مسجد نبوی میں بیٹھ کر علانیہ شراب پیتا تھا اور بد فعلیاں کرتا تھا۔
امام ابن حزم فرماتے ہیں۔ رجہرة الانساب ص ۳۴
وکان من افسق الناس شرب
یہ نہایت درجہ فاسق تھا۔ مسجد نبوی

البحر فی مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم
نہاراً وفسق فیہ یقینہ لبعض
اللہ و قتل بعض اهل المدينة بالسيف
والجوع وكان قیامہ ایام
المعتد و قتل اهل المدينة
ولم یصل بہا طول مدتیہ
فیہا جمعة و جماعة

میں علامہ شراب پیتا تھا اور بعض
اہل مدینہ کی چھوڑیوں کے ساتھ بدی
کرتا تھا۔

اہل مدینہ کو تلوار اور کھوک سے مارا
اس نے خلیفہ المعتز علی اللہ کے زمانے
میں بغاوت کی تھی۔ اہل مدینہ کو اس
قتل کیا کہ جب تک اس کا تسلط رہا

مسجد نبوی میں جمعہ کی نماز ادا نہ کی جاسکی۔ اور نہ جماعت کی۔

محمد بن الحسین بن جعفر بن موسیٰ الرکاظم اسے اور اسکے بھائی
علی بن الحسین نے مدینہ طیبہ میں بغاوت کی۔ سلمہ کا واقعہ ہے۔ اہل مدینہ
المعتز علی اللہ ہی کا عہد تھا۔ اس بغاوت کے احوال امام ابن حزم اس
طرح بیان کرتے ہیں۔ رجہرة الانساب ص ۵۸

ان دونوں نے مدینہ طیبہ میں سلمہ
میں بغاوت کی۔ وہاں کے لوگوں کو
قتل کیا اور ان کا مال لوٹا مدینہ طیبہ کو
ایسا تباہ کیا کہ مسجد نبوی میں پورے
ایک مہینے نہ جمعہ ہو سکا اور نہ جماعت
کی قطعاً کوئی نماز ہو سکی اور اس
محمد بن الحسین نے اپنے تسلط کے دوران
حضرت جعفر بن ابی طالب کی اولاد
میں سے تیرہ حضرات کو پکڑ کر شہید

وہما اللذان قاما فی سلمہ
بالمدينة فقتلا اہلہا و اخذوا
اموالہم و اخراہا بالمدينة حتی
یقیت لا یصلی فی مسجد رسول
اللہ علیہ وسلم شہراً كاملاً
لا جمعة و جماعة اصلاً و
قتل محمد بن الحسین حین
قیامہ ثلاثہ عشر رجلاً
من ولد جعفر بن ابی طالب

رضی اللہ عنہ صبرا و هو
ملقب بالملیط۔

ہو گیا یعنی جیت لے ننگ و نام)
ان نام نہاد سادات کرام اہل بیت رسول اللہ کی حرکتوں کے یہ چند نمونے
ہیں اور ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لوگوں کے قلوب ان سے کیوں
تمسقرہے۔ اور جس وجہ سے آل علی کی خلافت قائم ہونے کی تمام کوششیں
ناکام رہیں۔ اس قسم کی حرکتیں صرف اہل بیت آٹھ آدمیوں کی نہ تھیں، ان
پینیسٹھ میں سے اکثر کا کردار ایسا ہی لپست اور شرمناک تھا، تفصیل طویل
ہے اور موجب تداوت

اب اموی اور عباسی خلافتوں پر تنقید کرنے والوں کا طریقہ یہ ہے کہ
وہ تمام جرائم جن کا صدور بعض آل علی سے ہوا، ان کا ذکر نہیں کرتے اور
انہی جرائم کو کذب یا وافترا اموی اور عباسی خلفاء پر بھتوپ دیتے ہیں، اتنا
نہیں سوچتے کہ اگر خلفاء کرام نے ایسی حرکتیں کی ہوتیں اور ان بعض علویوں نے
اپنی پاک بازی اور عدل کوشی کی کوئی مثال قائم کی ہوتی یا امت نے ان کی
کارروائیوں کو کسی درجے میں تعمیری سمجھا ہوتا تو امویوں اور عباسیوں سے
ان کے دل بھر جاتے اور ان علویوں کی طرف قلوب مائل ہوتے، انہیں کامیاب
کرتے کہ لئے مسلمان جوق در جوق جان و مال کی بازی لگاتے کیلئے کھڑے
ہو جاتے۔ یعنی عالم یہ نہ ہوتا کہ ان میں سے کوئی ایک خروج بھی ایک ناکام
دقتی ہنگامے سے زیادہ کچھ نہ ہو سکا۔ اور امت کے قلوب خلافت قائم
ہی کی طرف جھکے رہے۔

ابن علقمی اور اس کے سیاحی ساتھیوں نے آل علی کی خلافت قائم کرنے
کے لئے ہلا کوٹھاں سے سارے یاز کی اور مرکز خلافت تباہ کر دیا۔ مگر نتیجہ صرف

یہ نکلا کہ امت پر بلا نازل ہوئی۔ ان کی لیستیاں اجڑ گئیں، لیکن آل علی کی خلافت قائم ہوتے کی بجائے مصر میں پھر خلافت عباسیہ ہی قائم ہو گئی۔ مسلمانوں نے بعد میں ان تاتاریوں کا وہ قلع فتح کیا کہ سب بدلہ لے لیا گیا۔ یعنی یہ لوگ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی اخلاقی برتری سے ایسے متاثر ہوئے کہ گروہ گروہ آکر اسلام قبول کرتے تھے۔ یوں عالم اسلام میں دعوت محمدیہ کی نشاۃ ثانیہ کا اللہ تعالیٰ نے انتظام کر دیا۔ پاسیان بل گئے کعبہ کو صنم خالوں سے۔

ہمارے زمانے میں اسی علوی خلافت قائم کرنے کی ہوس میں شریف حسین نے نصاریٰ سے ساز باز کی۔ اسلحہ اور اشرافیوں کے صندوق کے صندوق وصول کر کے بغاوت کی پوری پوری تیاری کی۔ اور عین اس وقت جب ترکی خلافت کے امیر المؤمنین نے کفار کے خلاف اعلان جہاد کیا، اس شخص نے کفار کے ساتھ ہو کر امیر المؤمنین کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ ترکی امیر عسکر کو جب اس کی ریشہ دوانیوں کی خبر ہوئی اور انھوں نے اس سے باز پرس کی تو اس شخص کے قاصد حرم شریف میں کعبہ کے قریب کھڑے ہو کر حلقیہ بیان دیا کہ انواہیں غلط ہیں اور میں پوری طرح عہد و قادیاری پر قائم ہوں۔ وہ صاحب ایمان شخص حقے مطمئن ہو گئے۔ لیکن شریف حسین اور اس کے لوگوں نے جو حرکتیں کیں، جس طرح قاصد حرم شریف میں ترکوں اور مخلص مسلمانوں کو شہید کیا، ان دلدوز واقعات کے عینی شاہد۔ شاید اب بھی موجود ہوں۔ مولانا خلیل احمد انصاریؒ نے بذل المجہود فی حل ایلی داؤد میں ایک حدیث پر بحث کرتے وقت یہ سب تفصیلات عینی شاہدوں سے معلوم کر کے بیان کی ہیں۔ جو حرم کے علماء و فقہاء میں ہیں۔ کتاب الفتن

الملاحم ج ۵، ص ۸۹) اس شخص نے شخص امت کا کلمہ ہی متفرق نہیں کیا
 برامام المسلمین کے خلاف بغاوت ہی نہیں کی، محض حرم میں لے گئے مسلمانوں
 و شہید ہی نہیں کیا۔ بلکہ اپنے نصرانی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے بعض
 ک خواتین تک کی وہ بے حرمتی کرائی جس کے بیان کو قلم کا سینہ شق ہوتا ہے
 اسی کے نتیجہ میں عالم اسلام پر وہ مصائب ٹوٹے کہ بظاہر ابھی تلافی
 وقت دور نظر آتا ہے۔ عرب کے ٹکڑے ہو گئے۔ فلسطین پر یہود قابض
 ہیں اور تمام بلاد عربیہ و اسلامیہ کفار کی ترک و تار سے نیم جان ہیں لیکن
 لشکر کا وعدہ قائم ہے۔ اس دور ابتلا سے مسلمان پھر ابھرے گے جس کے
 آثار پیدا بھی ہو رہے ہیں۔ **وَكَذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَعْتَدِلُ۔**

امیر عبدالرحمن اموی
 الداخل نے اگرچہ خلیفہ

ندلس کی اموی امارت و خلافت

باسی سے بیعت نہیں کی تھی لیکن خلیفہ اسلام انہی کو جانتے تھے جیسا کہ
 و فرمایا ہے اور اوپر مذکور ہوا۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ عباسی خلافت اور اموی
 امارت میں انتہائی چشمک اور عداوت ہوتی۔ لیکن امیر المؤمنین المنصور
 نے ابتدائی تاحامی کے بعد اندلس فتح کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ اور یوں تعلق
 کی سی فضا قائم ہو گئی۔ لیکن یہ بے تعلق سیاسی تھی، دینی اور خاندانی تعلق
 دستور قائم رہے۔ دونوں مملکتوں کے شہری اطمینان سے آتے جاتے تھے
 اس طرح اموی سادات کو خلافت عباسیہ میں اہم مناصب دئے گئے اور
 انہیں خاص مراعات سے نوازا گیا۔ اسی طرح بعض عباسی سادات کا قیام
 اموی امارت اندلس میں ثابت ہے۔ امام ابن حزم نے متعدد عباسیوں کا
 اندلس میں حکومت کے مہمانوں کی حیثیت سے رہتا بیان کیا ہے۔ پھر تفصیل

علم یا میر و سیاحت کے لئے اندلس کے مسلمانوں کا بلاد عربیہ میں آنا جاری رہا
اندلس کے ایک عظیم عالم حضرت امام یحییٰ بن یحییٰ المصحوبی جو موطا شریف
کے راوی ہیں وہی اس کو اندلس لے گئے تھے اور وہاں وہ عظیم کتاب ہا کھولا
ہا تھ لی گئی۔ علاوہ ازیں نئی وحدت اور دینی اخوت خود موطا شریف کی
تدوین سے ثابت ہے اور اندلس میں اس کی وہی حیثیت ہوئی جو خلافت
عباسیہ میں تھی۔ ہمارے بیان پر شاید عادل ہے۔ اموی حکمرانوں نے
یہ خیال نہیں کیا کہ اس کی تدوین عباسی امام نے کرائی ہے، علم کے بارے میں
سیاسی یا نسلی یا لسانی کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ اور نہ مسلمانوں
کے ہاں علم کی ایسا رہ داری کسی خاص خاندان میں تسلیم کی گئی بلکہ اسے اکتھو
روح اسلامی کے خلاف جانا۔

چنانچہ موطا کی تالیف میں اس کا کوئی خیال نہیں کیا گیا کہ روایت
فلاں خاندان کے افراد کی ہے۔ اسے نہ لیا جائے، یا اس کے راوی کا فلا
سیاسی موقف تھا۔ اس لئے اس کی روایت قبول نہیں جائے گی
وہاں صرف راوی کی عدالت اور اس کا علمی مقام دیکھا جاتا تھا چنانچہ
اس میں جہاں ہاشمی سادات کی مرویات اور فتاویٰ ہیں وہاں اموی سادات
کی مرویات و فتاویٰ کو بھی وہی حیثیت دی گئی ہے۔ جمل و صفین میں حصہ
لینے والے یا غیر جانب رہنے والے یا یوں کہ سیاسی نزاعات میں فریق
والے سب سے اس کتاب میں یکساں استفادہ کیا گیا ہے۔ عباسی امام
امام مالک سے جب اس کی سماعت کی تو حضرت امیر المؤمنین معاویہ بن
المؤمنین مروان اور امیر المؤمنین عبدالملک کی وہی علمی اور روحانی عظمت
تسلیم کی جو حضرت علیؑ اور حضرت ابن عباسؓ کی تھی بلکہ عبداللہ بن الزبیرؓ

کی بھی جن کی سیاسی حقیقتیں امولیوں اور ہاشمیوں دونوں سے رہی، اسی طرح
انڈس کی اموی امارت اور پھر خلافت میں ہاشمی سادات اور ابن الزبیر اور دیگر
وہ حضرات جو سیاسیات میں غیر جانب دار رہے۔ ان سب کی یکساں حیثیت
تسلیم کی گئی۔ اور سب کے ارشادات قانونی نظر سے لیں تو ان کی حیثیت سے سنے اور
سمجھے جاتے رہے۔ وہاں ایسا کوئی تصور نہیں تھا کہ ”ہم صرت اپنے سلسلہ
امارت ہی پر انحصار کرتے ہیں۔ اور بس۔“

اب ایک اور دلچسپ واقعے کی تفصیل بلا حنطہ ہو جس سے اندازہ ہوگا
کہ دینی اور ملی معاملات میں عباسی خلافت اور اموی امارت میں ہمیشہ یکسانیت
اور یا بھی اعانت کا تصور قائم رہا۔ مثلاً امیر المؤمنین المانوں کے زمانے میں
انڈس کے امیر عبدالرحمن الثانی تھے۔ اس زمانے میں مصر کے والی امیر
زیادۃ اللہ نے حقلیہ رسیلی پر دھاوا بول رکھا تھا۔ قاضی اسد بن فرات
کئی شہر فتح کرنے کے بعد شہید ہو چکے تھے، پھر محمد بن ابجاری نے قیادت
سنبھالی اور وہ بھی متعدد فتوحات کے بعد کلاں گھڑ میں وفات پا چکے تھے۔
اب امیر عسکر زہیر بن غوث تھے انھوں نے متعدد فتوحات کے بعد شکست
کھائی اور اسلامی لشکر محصور ہو گیا۔ اتنے میں رومیوں کی طرف سے
ایک بڑی امدادی فوج بھی آگئی جس سے مجاہدوں میں ہراس پھیل گیا اسی
عالم میں اچانک اندلسی بحری بیڑا ادھر سے گزرا جس میں تین سو جہاز اور
بیس ہزار سپاہی تھے، اس بحری لشکر کے افسر فرغوش تھے رحمۃ اللہ علیہ۔
انھوں نے جو صورت حال دیکھی تو وہیں رک گئے اور مسلم فوج کا ساتھ دیا۔
ادھر امیر زیادۃ اللہ کی طرف سے بھی مسلمانوں کو کمک پہونچ گئی، اب اسلامی
لشکر کافی طاقتور ہو گیا۔ فوج کی جدید ترتیب دی گئی اور سب نے بالاتفاق

اس کی کمان امیر فرغوش اندلی کے سپرد کر دی لیکن پھر سلمان شکست کھا کر
 یہ صورت دیکھ کر امیر فرغوش وہاں سے ہٹ گئے اور بزم پر حملہ کر کے
 اس کا محاصرہ کر لیا تا آنکہ فتحیاب ہوئے اور یوں پالا لشکر اسلام کے ہاتھ
 رہا۔ اس عظیم الشان فتح کے بعد امیر فرغوش کا بیڑا اپنے بھائیوں سے
 رخصت ہو گیا۔ انھوں نے یہ نہیں چاہا کہ اس فتح کے ثمرات میں حصہ لیا
 عیسیٰ لشکر کی یہ امداد محض فی سبیل اللہ کی گئی تھی اور صرف دینی اور ملی
 ہذبہ کا رفا تھا ملاحظہ ہو نصیر احمد جامعہ کی کتاب "مسلمان سسلی میں"
 ص ۴۸ و ۴۹، طبع سنگ میل پبلیکیشن لاہور۔

اب ملاحظہ ہو یورپ کے مورخوں کا یہ افتراء محض کہ اندلس کے حکمرانوں
 کو زیر کرنے کے لئے امیر المؤمنین ہارون الرشید نے شاہ فرانس شارلمین سے
 تعلقات قائم کئے تھے اور اس درجہ اس کی استمالت انھیں منظور تھی کہ
 القدس کے کلیسا کی کنجیاں اسے بھجوا دیں۔ دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ
 اندلس کی اموی امارت نے باز نطنی حکمران سے اپنے تعلقات استوار کئے
 تاکہ عباسی خلافت کو وہ پریشان کرتا رہے۔ یورپ کے مورخوں کی اس
 ہرزہ سرائی کا کوئی سراغ ہمیں قدیم مسلم مورخوں کے ہاں نہیں ملتا حالانکہ
 اگر اس منظر کشی میں صداقت کا شبہ بھی ہو تا تو اس کا ذکر ضرور کرتے دراصل
 یہ نصرانی مورخوں کے احساس کمتری کی ایک علامت ہے، ان کے سامنے مشرق و
 مغرب کے مسلمانوں کا تمدنی، تہذیبی، معاشرتی اور علمی تفوق تھا اور اقوام
 عالم میں ان کی سیاسی برتری تھی۔ ان کے مقابلے میں یورپ کی ذہنی
 روہانی، علمی، معاشرتی اور سیاسی پستی تھی۔ اس لئے انھوں نے عباسیوں
 اور امویوں کے مابین حقیقت بیان کر کے اپنے عوام کو تسلی دینے کی کوشش

کی ہے کہ ہمارے بادشاہ ایسے عظیم المرتبت تھے کہ مسلم حکمرانوں کو اپنے معاملات میں انکی امداد کی احتیاج رہتی ہے۔ یعنی کافروں کی مدد سے وہ ایک دوسرے کو زیر کرنا چاہتے تھے۔

اب ایک طرف دیکھا جائے وہ واقعہ جو اوپر بیان ہوا۔ اور دوسری طرف یورپ کے مورخوں کی یہ افترا پردازی، ان دونوں میں کوئی وجہ تطابق نظر آتی ہے؟۔ اموی سادات گرام کی عظمت و شرف اور ان کی تلہیت دینی غیرت اور امور مایہ میں تقویٰ شعاری کی ہم ایک اور مثال دینا چاہتے ہیں جب عباسی خلافت رو باسخطا ط ہوئی۔ ایک طرف مشرق میں مجوسی لائل یوہی خاندان امور خلافت پرستولی ہو گیا۔ اور دوسری طرف مغرب میں دوسرا مجوسی الاصل عبیدی خاندان، اذریوں خلیفہ عباسی کی حیثیت ایسی نہیں رہی کہ وہ آزادانہ قرآن امت انجام دے سکیں تو اموی امیر عبدالرحمن الناصر نے علماء و فقہاء کا ایک مجلس طلب کیا کہ خلیفہ اسلام کون ہو گا؟ اسکا امکان ہے کہ میں اپنے آپ کو خلیفہ کہہ سکوں۔ کیونکہ وہ اب اپنی قرآن میں صحیح طریقے پر ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہمارے اور ان کے درمیان عبیدی ملاحدہ کی حکومت اور پھر سمندر حائل ہے۔ تو اسوقت علمائے فتویٰ دیا کہ ایسی صورت میں دو خلافتیں قائم ہو سکتی ہیں۔ تب امیر عبدالرحمن الناصر نے اپنی خلافت کا اعلان کیا۔ اور امیر المؤمنین کہلائے اموی ذہنیت یہ نہیں تھی کہ جب چاہا اور جہاں چاہا چند آدمی جمع کئے اور خلافت کا اعلان کر دیا پھر چاہے نتیجہ چھوٹی نکلے۔ اموی حضرات ہر معاملے میں قواعد شرعیہ اور مفاد ملت پیش نظر رکھتے تھے۔ ویسے ہر خاندان میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور حالات کبھی سازگار ہوتے ہیں اور کبھی نہیں

سیاسی مدوجزر تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ امیر المؤمنین الناصر نے عباسی خلیفہ کی آئینی حیثیت کا انکار کر کے اپنی خلافت کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ ان کو خلیفہ اسلام تسلیم کر کے ایک شرعی جواز تلاش کیا کہ ایسے احوال میں دعوت خلافتیں ہو سکتی ہیں۔ اگر دین کے بجائے خاندانی عصبیت کا جذبہ ہوتا تو خلیفہ عباسی کی خلافت کا انکار کر کے اپنی خلافت قائم کرتے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ایسا اقدام ملت اسلامیہ کے ساتھ غداری ہوتا اور اس سے امت کا کلمہ متفرق ہو جاتا۔

یہ خلافت اس کے آل علی میں سے جتنے لوگوں نے اموی اور عباسی دور میں خروج اور بغاوتیں کیں وہ چونکہ تعمیری نہ تھیں اور نہ ان کا کوئی نئی نصیب العین تھا، اس لئے امت میں انھیں کبھی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ شخصی طالع آزمائی کے علاوہ ان کا کوئی مسلح نظریہ نہ تھا۔ پھر امت اس گروہ سے بھی نالاں تھی۔ جنھوں نے وقت بے وقت بلکہ ہمیشہ بے وقت ان غلو یوں کو ابھار کر میدان میں کھڑا کیا۔ اور پھر بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وجہ یہ بھی ہے کہ اموی خلافت خالص عربی حکومت تھی اور عرب اس کیلئے تیار نہ تھے کہ اپنی حاکمیت ختم کر دیں۔ اس لئے اموی دور میں غلو یوں کو ناکامی ہوئی۔ دعوت عباسیہ میں تمام مسلمانوں کی حاکمیت کا تصور تھا۔ اور ہر اسلامی ملک کو حکومت چلانے کی دعوت تھی۔ اگر غلو یوں کا تصور بھی ایسا ہی ہوتا تو شاید وہ کامیاب ہو جاتے مگر ان کے ہاں تو مدار اس پر تھا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت ہیں۔ اس لئے تمام امت کو ہماری حاکمیت تسلیم کرنی چاہئے۔ چنانچہ ان میں سے جو بھی کھڑا ہوا۔ اپنے ”ابن رسول اللہ“ ہونے ہی پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھی، آسمان

وزمین نے یہ منظر دیکھا ہے کہ ایک ہی خلیفہ کے خلاف کئی کئی ایٹمائے رسول اللہؐ کھڑے ہو گئے۔ مگر ان میں نہ یاہم کوئی رابطہ تھا نہ حکومت قائمہ کا تختہ الٹنے کا سامان، اور نہ انقلاب کے بعد کوئی نصب العین۔ جسے موقع ملا اس نے سود و سوہنار و دھنرار عجی لوگوں کو اپنے ساتھ بلایا۔ اور بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا، اور وہ بھی اپنے ہی خاندان کے دوسرے مدعیوں کے خلاف حریفانہ اگر کھڑے ہوتے تو کم از کم وقتی طور پر تو متحد رہتے۔

تاریخ کا طالب علم جب ان لوگوں کے ”یہ کارنامے“ دیکھتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ یہ ہے وہ تعمیر اور ارتقاء امت، اور اہل عالم کے لئے دائمی عدل عمرانی کی دعوت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری کی اور جس کے لئے آپ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے جان و مال کی بازی لگائی پہلی صدی ہجری سے لے کر اس چودھویں صدی ہجری میں شریف حسین کی بغاوت تک ایک ہی منظر سامنے آتا ہے ایسے یاغیوں کی امداد و حمایت کا اتہام امام اعظم ابو حنیفہؒ پر عائد کیا گیا جس کی حقیقت پچھلے اوراق میں کھول دی گئی ہے۔ اب یہ امت مرحومہ پر اللہ کا فضل ہے، اس کو وعدوں کی حقانیت ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی معجزانہ برکت ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کرامت ہے کہ نام نہاد ایٹمائے رسول اللہؐ کی لائی ہوئی ہر مصیبت یہ امت جھیل گئی۔ اور رہ رہ کر اپنی ہستی اپنی دعوت اور اپنے عزائم بر دے کا رلانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے تائید و یزدی سے اپنی نشاۃ جدیدہ کا انتظام کرتی رہی اور اب بھی یہی توقع ہے کہ پھر اس امت کو اقوام عالم میں وہی مقام حاصل ہوگا جو فطری طور پر اسکا ہے وَلِلّٰهِ الْاَكْمَرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللّٰهِ (الروم ۴)

اختلاف مذاہب

امیر المؤمنین الملائون کے عہد مبارک میں ایک نصرانی شخص نے اسلام قبول کیا۔ اور کچھ دن بعد مرتد ہو گیا۔ امیر المؤمنین نے اسے اپنے ہاں طلب کر کے پوچھا کہ ”اسلام سے تمہیں وحشت کس سبب سے ہوئی؟“ اس نے کہا۔ آپ کے دین میں مجھے اختلاف کی کثرت نظر آئی۔“ آپ نے فرمایا۔ ”ہمارے ہاں اختلاف دو قسم کا ہے ایک تو ایسا جیسے اذان کا ہے، جوازے کی تکبیروں کا ہے، پھر شہد کے اختلافات ہیں۔ عیدین کی نمازوں کے ہیں، ایام تشریق کی تکبیروں کے ہیں۔ قراتوں کے ہیں اور فتوے دینے کی دلیلوں کے ہیں اور ایسے ہی اور اختلافات ہیں۔ تو ان کو اختلاف نہیں کہا جاتا بلکہ یہ اختیار، توسع ہے اور تکلیف دور کرتا ہے۔ جس نے اذان کے کلمات دو دفعہ کہے لیکن اقامت میں یہ کلمات ایک ایک دفعہ کہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اسی طرح اذان میں بھی دو دو دفعہ کلمات کہے اور اقامت میں بھی تو امیر لوگ نہ ایک دوسرے کو غار دلاتے ہیں اور نہ عیب نکالتے ہیں۔ یہ بات تم عیاں تا تم خود ہی دیکھ رہے ہو اور ہمارے اس بیان کے گواہ ہو۔“

دوسرا اختلاف وہ ہے جو ہماری کتاب کی کسی آیت یا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کی تاویل میں ہو۔ حالانکہ ہم خدا کی طرف سے آیت کے نزول پر اور حدیث کی صحت پر متفق ہیں اگر تمہاری وحشت کا سبب یہ ہوا ہو اور اسی وجہ سے تم ہماری کتاب کا انکار کرتے ہو۔ تو پھر تو راہ اور انجیل پر بھی ایسا ہی اتفاق ہوتا چاہئے جیسا کہ ان کے الفاظ کا خدا کی

طرف سے ہوتے پر اتفاق ہے۔ اور یوں یہود و نصاریٰ میں تفسیر کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہئے۔ اگر اللہ چاہتا کہ کتاب ایسی نازل کرے اور امتیاز اور ان کے تائیدوں کے اقوال اس پنج پر ہوں کہ تفسیر میں کوئی اختلاف نہ ہو سکے تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔ لیکن ہم دینی اور دنیوی امور میں ایسا کہیں نہیں دیکھتے کہ خدا تعالیٰ وہ چیز اتاری ہو جو ہر حال میں کفایت کرے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو آرمایش اور محنت نہ رہتی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے اور مقابلے پر کامیابی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہوتا، آج پر وہ شخص پھر اسلام لے آیا۔ اور امیر المؤمنین نے سجدۂ شکر ادا کر کے حاضرین سے فرمایا آج اس پر رویہ دے کر کچھ احسان مت کرنا تاکہ اس اسلام آزاد نہ ہو۔ اور اس کا دشمن یہ نہ کہہ سکے کہ لایح کے سبب مسلمان ہوا۔ مگر آئندہ اس کے ساتھ کھلائی کرنے اسے امداد دینے اور اس کا دل بھاتے میں کسر مت رکھنا صلی اللہ علیہ وسلم، ج ۱ ص ۳۸۱)

امیر المؤمنین المامون نے اس حسن کے ساتھ یہ مسئلہ صاف کر دیا، کہ فقہاء اور متکلمین کے جو اختلافات ہیں ان سے علم میں ارتقا ہوتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف فرقہ بازی کا موجب نہیں ہونا چاہئے۔ اور جماعت کی مضبوطی اور امت کی وحدت پر حرکت نہیں آنا چاہئے اور نہ ایسی کوئی حرکت ہونی چاہئے جس سے مسلمانوں کا حال واستقبال تباہ ہونے کا خطرہ ہو۔ یہ جو بات بات پر کفر کے فتوے لگتے ہیں حتیٰ کہ مسجدیں بھی الگ کر لی ہیں اور ایک دوسرے کے بزرگوں پر سب و شتم کا بازار گرم ہے۔ اس کی اجازت نہیں، جو لوگ یہ حرکت کریں اور متحارب گروہ بن کر امت کا کلمہ متفرق کریں، ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے (الاتعام، ۱۶) اِنَّ الَّذِیْنَ

فَرَّقُوا دِيَارَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا كَسَتْ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ رَجُلٌ لَوْ كُنْتَ دِينًا
کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے (اے نبی) تمہارا ان سے کسی
معاملے میں کوئی تعلق نہیں۔)

سب اپنے اپنے فقہی اور کلامی مسائل پر قائم رہیں۔ مگر ایسی باتوں سے احتراز کریں جو دوسروں کے لئے موجب اذیت ہوں اور منافرت پھیلے تو ہمیں حکم ہے کہ کلمہ کی حرمت برقرار رکھیں ارشاد نبوی ہے

عن انس قال قال رسول الله
صلى الله عليه وسلم من صلى
صلواتنا واستقبل قبلتنا
واكل ذبيحتنا فذلك المسلم
الذي له ذمة الله وذمة
رسوله فلا تخفوا الله في
ذمته (رواه البخاري)

لیکن جب یہ ہی شخص قرآن پاک کے کلمات میں رد و بدل اور تحریف ثابت کرنا چاہے، مہاجرین اور انصار کو مرتد کہے اور ان کی راہ سے ہٹ کر چلے۔ اور دین میں وہ باتیں نکالے جو اس میں نہیں ہیں اور پھر اپنا جھوٹا لگ بٹا کر امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہے تو اس پر مذکورہ بالا تعریف صادق نہیں آتی اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے یہ وعید رکھی ہے۔

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ
مَا بُيِّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ
سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ تُوَلِّهِ مَا
تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَ
مَصِيرًا۔

جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی مخالفت کی حالانکہ ہدایت اس پر
 واضح ہو چکی تھی اور ایسی چال چلا جو
اہل ایمان کی راہ نہیں تو ہم بھی اسکا
منہ اسی طرف پھردیں گے جہنم سے
رخ کر رکھا ہو۔ اور پھر اسے جہنم
میں جھونک دیں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہو۔

ایک قابل توجہ جائزہ۔ اموی اور عباسی خلافتوں کے دینی اور آئینی
حیثیت کم کرتے کی بعض مورخ و مصنف کتنی ہی کوشش کر لیں۔ روایات
واہمہ کو حقائق کا رنگ دینے کے لئے کشاہی زور قلم صرف کر دیں یہ صورت حال
اپنی جگہ دائم و قائم ہے۔ کہ ان خلافتوں کا نظام قرآن و سنت پر مبنی تھا اور
اس کے چلانے والے، اول تو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کے
اسماء گراچی ہیں امیر المؤمنین و لیڈر اول کے عہد مبارک و مسعود تک ملتے ہیں
جنہوں نے اموی عہد میں مشرق و مغرب میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ پھر
مختص صحابہ کرام کے تربیت دادہ، ان کے مخلص اتباع اور ان کے بعد
ان کے اتباع جو ملت اسلامیہ کے عظیم ترین علماء و فقہاء و ائمہ ہیں شاہد
تک، کا زمانہ جو خیر القرون کہلاتا ہے۔ وہ صحابہ کرام اور ان کے اتباع کا عہد
ہے اور اسی مدت میں احکام دین کے کلیات و جزئیات پوری طرح مدون
ہو کر محفوظ ہو گئے۔

اب ایک طرف تو یہ حقیقت ثابت ہے اور دوسری طرف سیاسیوں کی
اور ان سے متاثر موقوفوں کی تحریریں ہیں، جو طبعاً ہر صاحب فکر کے دلیں

کھرجن پیدا کرتی ہیں۔ کہ یہ قرآن حکیم کیسی آخری کتاب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کے آخری رسول ہیں اور یہ امت کو نئی قسم کی آخری امت ہے کہ اپنے ہادی و موائی صلی اللہ علیہ وسلم کا پرہیزگارہ کردہ نظام تیس برس بھی اچھی طرح نہ چلا سکی اور پھر اس کا عالم ایسا ابتر ہو گیا کہ غاصبان قلات کے مظالم سہتی رہی، حکومت کے ہاکھوں دین مبین کے اصول و قواعد کی پامالی دیکھتی رہی اور صدیوں ان ظالموں اور غاصبوں کے دامن سے عقیدت اور وابستگی کی معصیت میں مبتلا رہتے کو تقاضائے دین یا ور کرتی رہی اور نام نہاد آل رسول میں سے جو لوگ ان ظالموں غاصبوں اور دین سے بے پروا حکمرانوں کے پیچھے استبداد سے نجات دلانے کو بارہا کھڑے ہوئے، انکی حیات و نصرت سے اپنا دامن بچاتی رہی۔ اگر اسی پر بس ہوتا تو اہل عالم اسے امت کی بے حسی سمجھ لیتے۔ مگر اس نے تو بے راہ روی کی حد گردی کہ ظالم و غاصب حکمرانوں کے ایک اشارے پر حقوق درجوع جان و مال کی بازی لگانے اور ان کی حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے ہمت نہ صرف جہاد ہو جانا اس کا شعار رہا۔

اس امت کی فزق شناسی کی انتہا یہ ہے کہ جب ”ظالم و جائز“ بنی امیہ کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اور ان میں سے تنہا ایک شخص راہ کے تمام مصائب جھیلنا ہوا۔ اندلس پہنچا تو وہاں اسے ہاکھوں ہاتھ لیا گیا۔ کسی نے نہ سوچا کہ یہ ایک دشمن دین کھڑا لے کا فرد ہے۔ اور یوں سپاہ بنیہ میں پھر اسی ظالم و جاہل اور دین سے بے پھرہ اموی خاندان کی ایسی حکومت قائم ہو گئی جہاں کئی صدیوں تک وہ علماء و فضلاء پیدا ہوتے رہے جن کی علمی کاوشوں پر مسلمانان عالم کو آج تک کیا کچھ فخر و ناز ہے۔

یہ تھے قریش کے بطل جلیل اور بنی امیہ کے سورما امیر عبدالرحمن الداخل
آپ سے جب اندلس میں دریافت کیا گیا کہ بیعت خلافت کی لینا چاہتے ہیں
یا امارت کی تو اس مرد حق نے فرمایا "خلافت کی بیعت مشرق (عراق) میں
ہو گئی۔ میں صرف امیر ہوں" آپ اگر چاہتے تو اندلس میں حریف خلافت
قائم کر سکتے تھے۔ مگر اموی سادات امت مسلمہ کے خادم اور خیر خواہ تھے
ان کی لہجیت نے اجازت نہ دی کہ منصب خلافت کا استحقاق کریں۔ اور
جماعۃ المسلمین کے اجماع کی بے وقعتی کے مرتکب ہوں۔

پھر اس مرد حق اور شہباز صداقت و عظمت کی یہ بات بھی سبائیت
زدہ مؤلفین کے لئے خاص کر حیرت انگیز ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے
انقلاب آیا۔ اس کے خاندان کی حکومت چلی گئی، لیکن ہسپانیہ جا کر اس نے
ان بہیمانہ حرکتوں میں سے کسی ایک کا بھی تذکرہ نہیں کیا۔ جو اموی سادات
کرام کی قتل عام، ان کے مقابر کے انہدام اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی
کے دلہرہ و زناظر کا خاکہ پیش کرتے ہیں ابوحنیف جیسے کذاب لے ابدار کی
پھر سبائی مصنف زور قلم صرت کرتے رہے جن سے دوسرے لوگ اپنی
تباہی میں اندھی تقلید سے نقل کر آتے چلے آ رہے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی
ہوتی تو اندلس کے مورخوں کی تحریروں میں کچھ تو انکا تذکرہ ہوتا انقلاب
حکومت میں کشت و خون اتنا ہی ہوا جتنا فوجی انقلاب میں عموماً ہوتا ہے
اس سے زیادہ سب کذب محض ہے۔

علاوہ ازیں اس امت کی یہ بات بھی ہر دل میں کھٹک پیدا کرتی ہے
کہ جب تاتاریوں کے ساتھ سبائی رافضیوں کی ساز باز کے نتیجے میں خلافت
عیاسیہ مشرق میں ختم ہوئی۔ بغداد شریف کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی

تو پھر بھی اطمینان کا سانس لینے کی بجائے مسلمانوں نے مزوری یہ سمجھا کہ نئے سرے سے اپنی ظالم و غاصب عباسیوں کی خلافت مصر میں قائم کی جائے۔ حالانکہ ان خلفاء کے ہاتھ میں اب فوجی و حربی طاقت بھی نہیں تھی مگر عالم اسلام میں انہی خلفاء کو پیشوا کے امت سمجھا جاتا تھا حتیٰ سلاطین ہند کے کتبوں و رسکوں میں ان کے اپنے ولقب کے ساتھ قسیم امیر المؤمنین، نائب امیر المؤمنین لکھے جاتے تھے، اور بعض کتبوں میں خلیفہ عباسی کے نام کی صراحت بھی تھی۔ شاہان دہلی کے علاوہ سلاطین برکالا، سلاطین مالوہ و بہمنہ دکن و جوئیور سب کی عقیدت کی یہ کیفیت تھی وہ اپنی مستقل بادشاہ و سلطان نہیں جانتے تھے بلکہ عباسی خلیفہ زماں کا نائب اپنے کو سمجھتے اور کہتے تھے سلطان محمد تغلق شاہ کو اس بارے میں جو غلو تھا۔ ضیاء بیری مصنف تاریخ فیروز شاہی نے تفصیلاً ذکر کیا ہے ابتدائی فقرات ملاحظہ ہوں۔

در خاطر سلطان افتاد کہ سلطنت و امارت سلاطین بے امر دادن خلیفہ کہ از آل عباس بود درست نیست و ہر بادشاہ کہ بے منشور خلفائی عباسی بادشاہی کردہ است یا بادشاہی کند متغلب بودہ است و متغلب بودہ۔

سلطان محمد تغلق شاہ کے دل میں آیا کہ خلیفہ عباسی کی اجازت کے بغیر حکومت جائز نہیں۔ جن بادشاہوں نے خلفائے عباسی کے فرمان کے بغیر حکومت کی ہے یا آئندہ کریں وہ غاصب کہے اور غاصب ہوں گے۔

چنانچہ ۶۲۲ھ میں سلطان مذکور کی عرضداشت پر دربار خلافت عباسیہ مصر سے جب خلعت و لوائے سلطنت اور فرمان آیا سلطان نے تمام اراکین دولت و علماء و مشائخ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا اور سواری سے اتر کر فرمان و خلعت کو سر پر رکھا۔ اس کے درباری شاعر بدر چاہ نے متعدد قصائد

سارے میں لکھے ایک قصیدے کے یہ چند شعر سنئے۔ کہتا ہے سہ

شہنشاہ شریعت یوں منشور شد کتاب
علی اللہ ماہ ابن احمد ابوالعباس امیر المؤمنین

ایں زماں قائم مقام او امام اکبر است
آنکہ آل دودہ عباس سر در شراست

آنکہ بر تخت خلافت راجہ لاش زبور است

فتاب شرع و ملت آسمان ملک دین

تقریباً سارے تین صدی بعد آخری عباسی خلیفہ مصر نے ۹۲۳ھ میں ترکی

ال عثمان کے سلطان سلیم کو منصب جلیذہ سپرد کر دیا تھا ۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۵ء

تک ترکی سلاطین بحیثیت امیر المؤمنین عباسی حکومتوں کی نظروں میں خاں کی طرح

ٹھکتے تھے۔ شریف حسین کو آلہ کار بنا کر دشمن اسلام قوتوں نے ترکی خلافت کا خاکہ

کرا دیا تھا مسلمانان ہند میں جو بیجان و مشغوب سا اہا سال تک ہوتا رہا وہ

اسی شہنشاہ کی بنا پر تھا جو مسلمانان عالم کی اس مرکزی قوت سے کھٹی اب سوچنا

چاہئے کہ ملت اسلامیہ کی یہ عقیدت اور شہنشاہ کی خاص کراموی عباسی خلافتوں

سے کیوں رہی اور بقول بیابیت زدہ اہل قلم جن "آل رسول" کے خون کا

بدلہ لینے کے لئے عباسی خلافت کفار تبار کے ہاتھوں ختم کرا دی گئی اور جن

آل رسول کی خلافت قائم کرنے کے لئے ابن علقمی و نصیر طوسی جیسے روافض نے

ہلا کو کے ٹڈی دل کو خفیہ سازشوں سے بلایا تھا ان کی خلافت کیوں نہ

قائم ہو سکی۔ نیز شریف حسین نے "آل رسول" کی خلافت قائم کرنے کے لئے

جو کچھ کیا اس کا نتیجہ وہ کیوں مرتب ہوا جو دنیا دیکھ رہی ہے۔ ان امور پر اگر

غور کر لیا جائے اور جاہلی تعصب کی عینک کچھ دیر کے لئے آدمی اتار دے اس پر

کھل جائے گا کہ امت مسلمہ میں کامیابی اسے ملتی ہے جو قواعد دینیہ کی پاسداری

کرنے، آداب سیاست و جہان بینی سے بہرہ ور ہو۔ رائے عامہ اپنے حوزہ

میں استوار کرے اور ملت کے سامنے کوئی واضح تعمیری نصیحتیں رکھے۔

یہی سبب ہے جو علوی اشخاص کے خدو چوں میں نہ عامۃ المسلمین
 کبھی ساتھ دیا اور نہ علماء و فقہاء نے حکومت قائمہ کے خلاف یا غیہ
 اقدامات کی کسی ہنج تائید کی علویوں کی یہم شکستوں اور ناکامیوں
 کو حفظ دین کے لئے ایشار و قربانی کا رنگ دینے کو بلا حلف ہوں کیسے
 کیسے مہمل قصے تراشے گئے۔ امیر المؤمنین ہشامؒ جیسے نیک صنف
 خلیفہ کے خلاف زید بن علی بن الحسینؒ جو باغیانہ اقدام میں مارے گئے
 تھے ان کی تقدیس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بول کر
 ایک اکذب الاحادیث وضع کر ڈالی ترجمہ بحوالہ الاسلام الصیح
 طبع بیروت ۱۳۵۲ھ

بنی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ زید بن حارثہ کی طرف اٹھی تو
 فرمایا میرے اہل بیت میں سے ایک مظلوم کا یہی نام
 ہوگا۔ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے اور میری امت
 میں سے سولی پر لٹکائے جاتے والے کا یہی نام ہوگا زید بن حارثہ
 کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "زید تم مجھ سے اولاد
 قریب ہو جاؤ۔ اللہ تمہاری محبت میرے دل میں اور
 زیادہ کرے کیونکہ تمہارا نام میری اولاد میں سے ایک
 پیارے بیٹے زید کا ہے۔"

یہ زید جہنم کذاب راوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب
 الفاظ میں میری اولاد میں سے ایک پیارے بیٹے کہلوایا ہے حضرت حمید
 کے پوتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت رحلت قربانی سے نصف صدی
 سے زیادہ عرصہ بعد تولد ہوئے۔ اور آپ کی وفات سے ایک سو بارہ

برس بعد حکومت قائمہ کے خلاف بغاوت میں مارے گئے۔ ان صاحب کو جو
 احکام شریعت کی خلاف ورزی میں جہالت سے علیحدہ ہو کر بغاوت
 میں مقتول ہوئے ”زید شہید“ کہا گیا۔ پھر ان زید سے کوئی بیس یا بیس
 سال بعد حکومت قائمہ کے خلاف دوسرے علوی فرد محمد نام الارقط لقبی
 ۱۲۵ھ میں علم بغاوت بلند کیا۔ یا غیاثہ اقدام کی کامیابی کے واسطے
 ضعیف الاعتقاد عوام کو بہکانے کے لئے اپنے کو ”ہمدی“ کہا اور کہلوا یا
 ان کے بھی اسی طرح مقتول ہوتے پر سیاہی راوی نے دیو مالائی قماش
 کی یہ جھوٹی کہانی گھڑ ڈالی کہ محمد الارقط کے بغاوت میں مارے جانے سے
 ایک سو پینتیس برس پہلے ہی آنحضرت صلعم نے ان کے مقتل گاہ پر مع جماعت
 صحابہ نماز جنازہ پڑھ کر فرمایا تھا کہ یہاں میری اولاد سے ایک ”دلفس زکیہ“
 مقتول ہوگا۔ اموی اور عباسی خلفاء کے مفروضہ مظالم میں ”نفس الزکیہ“
 کا پروپیگنڈا اس شدت سے کیا گیا کہ نام کے بجائے یہی سیاہی لقیاب بھی
 مودودی صاحب جیسے ”مفکر اسلام“ کی زبان قلم سے یار یا راد ہوتا
 ہے۔ خیر القرون کے مسلمان ”ابناء رسول“ کی حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے
 اور خوب جانتے تھے کہ آنحضرت کے صلیب منظر سے چار صاحبزادے ہوئے
 جو سب بچپن میں فوت ہو گئے۔ آپ کے کسی فرزند کا سن بلوغت پہنچتا نہ تھا
 الہی میں نہ تھا۔ فرما دیا گیا وَاَكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ سِرِّ جَالِكُمْ وَلٰكِن
 رَّسُولِ اللّٰهِ وَخَاتَمِ النَّبِيِّينَ اور محمد تم میں سے کسی ایک مرد کے بھی باپ
 نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین چاروں فرزند ان رسول اللہ
 قاسم، و طاہر و عبد اللہ و ابراہیم علیہم السلام کا بچپن ہی میں وفات پا جاتا ہیں ثبوت
 ہے کہ اس دنیا میں نہ کوئی فرزند رسول اللہ ہے اور نہ ”ابناء رسول“ کی کوئی ذریت

خلافت کا راز بھی اسی میں پنہاں سمجھئے کہ وہم وراشت نہ پیرا کہیں ہو۔
جو زندہ رہا ہوتا بیٹا نبی ص کا
نہ اٹھتا وہ خود تو کوئی اور اٹھاتا
عجب کیا وہ کرتا وراشت کا دعویٰ
نواسوں کی تاریخ کو دیکھ دیتا

نواسوں کی تاریخ منظر ہے اسکی

کہ بیٹے نبی کے رہے کیوں نہ باقی

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اولاد علیؑ کے ادعائے خلافت
کے سلسلہ میں اپنے مخصوص طرز سے اظہار حقیقت ان الفاظ میں
کر دیا ہے (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۲۸۲)

”در عنایت ازلی مقرر بود کہ هیچ گاہ حضرت مرتضیٰ و اولاد

تا دامن قیامت منصور نہ شوند و هیچ گاہ خلافت ایشان

علی و جہا صورت نہ گیرد بلکہ از میان ایشان ہر کہ

دعوت بخود کند و بقتال برآرد و محذور بلکہ مقتول

گردد و خدای تعالیٰ فرماید و لَقَدْ سَبَقَتْ کَلِمَتُنَا

لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ۔ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ

وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ

و للخلقاء الذین ہم خلقاء الانبیاء حقاً سوۃ

المرسلین فہم المنصورون و ہم الغالبون۔

ختم شد

سیرۃ امام اعظم ابوحنیفہؒ

اتهام شیعیت کی حقیقت

مرتبہ

پروفیسر حکیم سید علی احمد عباسی ایم، ایں، سی علیگ

فاضل اسلامیات

محمد امجد علی ایبرہا لیاقت آباد کراچی ۱۹